ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

August 2018

www.inzaar.pk

ماہنامہ

اِنذار

اگست 2018ء ذوالقعدہ/ذوالحجہ 1439ھ

جلد 6 شمارہ 8

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زر تعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زر تعاون بذریعہ پوسٹل بیرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

بڑی عدالت

آخر کار ایون فیلڈ ریفرنس کیس میں نواز شریف کو دس، مریم نواز کو سات اور کیپٹن صفدر کو ایک برس کی سزا سنادی گئی۔ جرمانہ اور جائیداد ضبط کیے جانے کی سزا اس کے علاوہ ہے۔ نواز شریف کے مخالفین نے فیصلے پر جشن منایا جبکہ حامیوں نے اسے ظلم اور سازش قرار دیا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا کیونکہ اس دنیا میں مکمل حقائق کبھی سامنے نہیں آتے۔

مگر عنقریب ایک بڑی عدالت قائم ہونے والی ہے۔ یہ نواز اور مریم نواز جیسے بڑے لوگوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے لگائی جائے گی۔ ہم میں سے ہر شخص کو اس عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔ اگر کوئی ظلم، کوئی فریب، کوئی حق تلفی اور کسی قسم کی کوئی برائی نامہ اعمال میں ہوگی تو خدا کی عدالت اپنا فیصلہ سنائے گی۔ مگر فیصلہ سنانے سے قبل ہر ثبوت پیش کیا جائے گا۔

فرشتوں کا مرتب کیا ہوا مکمل ریکارڈ خدائی عدالت میں پیش ہوگا۔ تنہائی میں کی گئی گفتگو سب کے سامنے سنادی جائے گی۔ خفیہ سازشوں اور مکر کی ہر کہانی اس طرح بے نقاب کی جائے گی کہ لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں گے۔ دلوں کے بھید مکمل طور پر ظاہر کر دیے جائیں گے۔ کوئی مجرم اگر اس پر بھی اپنے جرائم سے منکر ہوگا تو اس کا منہ بند کر کے اس کے ہاتھ، پاؤں، جلد حتیٰ کہ اس کی زبان سے بھی اس کے خلاف گواہی دلوا کر حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا۔

آج ہر شخص کی زبان پر نواز مریم کیس کا فیصلہ ہے، مگر لوگ یہ بھولے ہوئے ہیں کہ بہت جلد خدا ان کا فیصلہ بھی کرنے والا ہے۔ لوگوں کو اپنے فیصلے کے سنگین اور ابدی نتائج کا اندازہ ہو جائے تو وہ سیاست کو بھول کر اپنی توبہ اور اپنی اصلاح کا عمل شروع کر دیں۔ مگر افسوس آج ہر شخص دوسروں کا محتسب بنا ہوا ہے اور اپنے آپ کو بھولا ہوا ہے۔ خود اپنے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کو تکلیف دیتا اور ان کی حق تلفی کرتا ہے۔ ایسے غافل لوگ خدا کی عدالت سے کبھی بری نہیں ہو سکتے۔

ووٹ کس کو نہ دیں

مجھ سے آج کل اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کس کو ووٹ ڈالا جائے۔ میں اس حوالے سے صرف دو باتیں عرض کروں گا۔ پہلی یہ کہ ووٹ دیتے وقت آئیڈیل امیدوار کا تصور ذہن سے نکال دیں۔ سوائے انبیا علیھیم السلام کے کوئی آئیڈیل نہیں ہوسکتا نہ ان کے سوا کسی کی حکومت آئیڈیل تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ خلافت راشدہ جیسے دور میں بھی حضرت عثمان اور حضرت علی کو غیر آئیڈیل قرار دے کر شہید کر دیا گیا۔ باقی رہے حضرات ابو بکر و عمر تو یہ دونوں صرف اس لیے غیر متنازع رہے کہ پہلے انصار اور پھر سیدنا علی نے مثبت ذہن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی مخالفت کے بجائے موافقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ورنہ جو بغاوت بعد میں ہوئی وہ پہلے ہو جاتی۔ خلافت راشدہ کسی آئیڈیل حکومت کا نہیں، اس آئیڈیل سماج کا نام تھا جو صحبت مصطفوی نے تخلیق کیا تھا۔

اس لیے جب کوئی پارٹی یا امیدوار آئیڈیل حکومت کی باتیں کرتا ہوا آئے تو اسے فوراً رد کر دیں۔ ہر امیدوار سے کہیں کہ ہر مسئلے کے حل کی امید نہ دلاؤ، جو تم یقینی طور پر کر سکتے ہو صرف وہ بتاؤ۔ جو مکمل تبدیلی کی بات کرے اسے رد کر دیں۔ کیونکہ ایسا شخص آپ کو بے وقوف بنانے آیا ہے۔

دوسری اور آخری بات یہ ہے کہ جو امیدوار اور پارٹی ایک دفعہ آپ کو مایوس کر چکی ہو، دوبارہ اس کو ووٹ نہ دیں۔ چاہے وہ مستقبل کے لیے کتنے ہی اچھے وعدے کیوں نہ کرے۔ یاد رکھیے آپ کا اصل ہتھیار سیاستدانوں کو رد کرنا ہے۔ آپ نے بری کارکردگی کے باوجود بھی سیاستدانوں کو ووٹ دیا تو اگلی دفعہ زیادہ بری کارکردگی کے لیے تیار رہیں۔ سیاستدان اس محبوب کی طرح ہوتا ہے جسے جتنی زیادہ محبت ملے وہ اتنا ہی آپ کو خوار کرے گا۔

اس لیے سیاسی قائدین سے عشق نہ کریں۔ ان کی کارکردگی کی بنیاد پر ان کا فیصلہ کریں۔ اس سے ہارنے والی جماعت کو نصیحت ملے گی اور جیتنے والی جماعت میں آپ کا خوف بیٹھ جائے گا۔ یہی چیز سیاستدانوں کو راہ راست پر رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

انقلاب اور تدریج

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ وہ انسانوں کو نو مہینے ماں کے پیٹ اور کئی برس کے بچپنے کے بعد جوانی کے بام عروج پر پہنچاتے ہیں۔ ننھا پودا کئی برس میں بھرپور درخت بنتا ہے۔ یہ سارے حقائق بتاتے ہیں کہ خدا جیسی قادر مطلق ہستی جو ایک لمحے میں سب کچھ کرسکتی ہے، اس نے جو دنیا بنائی وہ تدریجی تبدیلی کے اصول پر چلتی ہے۔ خدا کی اس دنیا میں جو انسان انقلابی تبدیلی سے مثبت نتائج کی توقع لگاتا ہے، اس کے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں آتا۔

مگر بدقسمتی سے ان سارے حقائق کے باوجود مسلم معاشروں میں ایک طویل عرصے سے انقلابی سوچ کے حامل مفکرین نے اپنی فکر کے بیج بوئے ہیں۔ اس فکر میں کسی حکمران کو ہر شر کا ماخذ سمجھ کر شیطان قرار دیا جاتا ہے۔ یہ یقین کرلیا جاتا ہے کہ اس کے رخصت ہوتے ہی سارے مسائل ختم ہوجائیں گے۔ پھر نئی حکومت گویا کہ جادو کی ایک چھڑی گھما کر سارے مسائل حل کردے گی۔

چنانچہ پورا عالم اسلام اسی سوچ کا شکار رہا ہے۔ پچھلے سو برسوں میں جتنی انقلابی تبدیلیاں عرب سے افریقہ اور ایران سے پاکستان تک عالم اسلام نے دیکھی ہیں، شاید ہی کسی اور نے دیکھی ہوں، مگر نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں ایک تدریجی عمل سے گزر کر تبدیلی آئی۔ جس کے بعد مغرب کی امامت میدان سیاست ہی میں نہیں بلکہ علم، تہذیب، زبان، ثقافت غرض ہر پہلو سے دنیا پر قائم ہے۔ اور اب چین بھی اسی تدریجی تبدیلی کے راستے پر چل کر وہ سپر پاور بن رہا ہے جس کا مقابلہ مغرب بھی نہیں کرسکے گا۔

قطع نظر اس کے کہ کوئی حکومت یا حکمران کتنا برا ہے، انقلابی تبدیلی اپنی ذات ہی میں تبدیلی کا ایک تباہ کن طریقہ ہے۔ یہ بظاہر جتنی بھرپور اور تیز رفتار محسوس ہوتی ہے، باعتبار نتائج وہ اتنی ہی

غیر موثر اور غیر مفید ہوتی ہے۔اس کے برعکس تدریجی تبدیلی ہمیشہ بہتر اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس حقیقت کو اپنی قومی تاریخ کی چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلی مثال ملک میں آنے والی فوجی حکومتوں کی ہے۔ ہمارے ہاں آنے والی ہر فوجی حکومت نے ڈنڈے کی طاقت اور سنسر شپ کے سہارے پر اپنے آغاز میں بظاہر استحکام، ترقی اور امن و امان کا تاثر دیا مگر ہر دفعہ مجموعی طور پر ملک کو ان کے انقلاب کے بدترین نتائج بھگتنے پڑے۔ ملک ٹوٹنے، دہشت گردی، منشیات، اسلحہ کی فراہمی کے علاوہ انتہا پسندی جیسے تمام تحفے مختلف مارشل حکومتوں کی وہ عطایا ہیں جن کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔مگر غالباً اس کا سب سے بڑا نقصان پختہ سیاسی قیادت کا منظر عام پر باقی نہ رہنا تھا۔ کیونکہ ہر ڈکٹیٹر پرانی سیاسی قیادت کو رد کر کے اپنی نرسری میں اپنے منظور نظر سیاستدانوں کو پالتا تھا۔ایسے سیاستدان قومی مفاد پر ذاتی مفاد، میرٹ پر خوشامد اور دیانت پر کرپشن کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ اقتدار میں آ بھی جائیں تو ملک کی بربادی ہی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ڈکٹیٹروں کے علاوہ عوامی قوت بھی اس انقلابی تبدیلی میں استعمال ہوتی رہی ہے۔مگر اس کے نتائج بھی ہمیشہ برے ہی نکلے ہیں۔اس کو دو حالیہ مثالوں سے سمجھتا جا سکتا ہے۔پہلی مثال جنرل مشرف کی ہے۔ جنرل مشرف کے دور میں پاکستان کی معیشت بہت بہتر جگہ پر تھی۔ ڈالر مشرف صاحب کے دور میں یعنی صرف دس سال پہلے تک ساٹھ روپے کا تھا۔پھر اس کے بعد مشرف صاحب کے خلاف ایک تحریک چلی ان کو اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا۔ایوان صدر میں مشرف صاحب کی جگہ زرداری صاحب آ گئے۔ اور پھر سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ معاشی معاملات اور امن و امان کے حالات کس طرح خراب ہوتے چلے گئے۔ڈالر سو روپے کا اور انسانی جان اس سے بھی زیادہ بے وقعت ہو گئی۔

دوسری مثال نواز شریف صاحب کی اقتدار سے نااہلی ہے۔اس کے نتیجے میں ملک میں جو سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا اس کے معاشی نتائج 124 روپے کے ڈالر کی شکل میں آج سب کے سامنے ہیں۔ یہی نواز شریف جب ایک تدریجی عمل کے ذریعے سے اقتدار میں آئے تو ملک میں امن وامان کا مسئلہ بھی بہتر ہوا اور بجلی کا بحران 2013 کی بہ نسبت بہت کم ہو گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا واحد موقع تھا جب ایک حکومت کسی انقلاب کے بجائے تدریجی طریقے سے رخصت ہوئی اور نئی حکومت نے معمول کے مطابق اقتدار سنبھالا۔

ایک اور حالیہ مثال وہ ہے جس میں وزیر اعظم نواز شریف کے بعض وزیروں نے جنرل مشرف کو ''مرد کا بچہ'' نہ ہونے کا طعنہ دیا اور آئین توڑنے کے جرم میں ان پر مقدمہ چلا کر پھانسی پر چڑھانے کا عظیم انقلابی ارادہ فرمایا۔اس کے بعد ''مرد کے بچوں'' کی طرف سے جو جواب آیا آج اس کے نتائج نہ صرف نواز شریف بلکہ پوری قوم بھگت رہی ہے۔

ملک کے حالات میں پیدا ہونے والی یہ ساری بہتری یا خرابی نواز شریف، جنرل مشرف، آصف علی زرداری یا دیگر فوجی ڈکٹیٹروں کی خامیوں اور خوبیوں کی بنا پر نہیں۔ اصل مسئلہ انقلابی اور تدریجی تبدیلی کا ہے۔ انقلابی تبدیلی جذبات کو بہت تسکین دیتی ہے۔ اس سے غصہ بھی دور ہوتا ہے۔مگر مجموعی طور پر یہ قوم کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح نہ بھی ہو تو ہر حال میں ترقی کا عمل سست کر دیتی ہے۔ جبکہ تدریجی تبدیلی ہمیشہ خیر پیدا کرتی ہے۔ گرچہ اس خیر کی رفتار کچھ ہلکی ہوتی ہے۔مگر رفتہ رفتہ یہ محکم ترقی کی اساس بن جاتی ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ پاکستانی عوام جذباتی بحران سے باہر نکلیں۔ انقلابی تبدیلی کے بجائے تدریجی تبدیلی کے عمل پر یقین کریں۔ تدریجی تبدیلی کے راستے میں کچھ صبر کرنا پڑتا ہے، مگر اس کے نتائج بہت دیرپا اور مثبت ہوتے ہیں۔

خدا کے نام پر کھڑے ہونے والوں کا انجام

جو قومیں دنیا میں خدا کے نام پر کھڑی ہو جائیں، ان کو دنیا ہی میں خدا کی طرف سے ملنے والی جزا و سزا کا زندہ نمونہ بنا دیا جاتا ہے۔ اہل پاکستان اس سزا و جزا کی ایک بہترین مثال ہیں۔ جب انھوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ وہ اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تو ہندوؤں اور انگریزوں کی تمام تر مساعی اور مسلمانان ہند کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دنیا کی پانچویں اور عالم اسلام کی سب سے بڑی ریاست پاکستان کی شکل میں نہ صرف وجود میں آ گئی بلکہ نامساعد ترین حالات میں بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

مگر اس کے بعد اسلام کا نام لے کر منافقت کو دنیا میں متعارف کرانے کے جرم کا ارتکاب اہل پاکستان جس تسلسل کے ساتھ کر رہے ہیں، اسی تسلسل کے ساتھ ان کے جرائم کی سزا ان پر مسلط کی جا رہی ہے۔

نماز، حج، عمرہ، روزہ، ڈاڑھی، ٹوپی کی دھوم میں کرپشن، رشوت، ملاوٹ، بددیانتی، خیانت کا جو نمونہ ہمارے سرکاری ملازموں اور تاجروں سے لے کر عام مزدوروں کے رویے میں نظر آتا ہے، اس کی کوئی مثال شاید دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہ کر سکے۔ اسی لیے بہترین وسائل کے باوجود اتنے بدترین معاشی حالات دنیا کی کسی قوم پر مسلط نہیں۔

اسلام کا نام لے کر دہشت گردی، قتل و غارتگری کا ارتکاب اور اس کی علانیہ و خاموش حمایت جس طرح اہل پاکستان کے مذہبی طبقات نے کی ہے، دنیا میں اس کی کوئی دوسری مثال کم ہی ملے گی۔ اسی لیے ہم پچھلے کئی عشروں سے امن و امان سے محروم کر دیے گئے ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی سے وابستگی کا اعلان کرتے ہوئے بھی فرقہ بندی اور مذہبی تعصب کا جو نمونہ ہمارے مذہبی گروہ پیش کرتے ہیں، اس کی مثال دنیا میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ایک قوم ہوتے ہوئے تقسیم در تقسیم ہونے کی ہماری جیسی مثالیں بھی کم ہی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے حکمران سرے محل، لندن فلیٹ اوراس طرح کے متعدد نا قابل تردید نا جائز اثاثوں کے ہوتے ہوئے جس تواتر سے اللہ اور رسول کو اپنی بے گناہی پر گواہ بناتے ہیں اور عوام جس شوق اور محبت سے ان کو ووٹ دیتے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال کم ہی اس دنیا میں پائی جاتی ہوگی۔ اسی لیے بدترین حکمرانی کا جونمونہ آج پاکستان میں نظر آتا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں کم ہی پائی جاتی ہے۔

اور حال ہی میں ایاک نعبد وایاک نستعین کہتے کہتے غیر اللہ کی چوکھٹ پر جھک جانے والے لیڈر کا دفاع کرنے کی سعادت بھی یہ قوم جس طرح حاصل کر رہی ہے، اس کا کوئی دوسرا نمونہ بھی شاید ہی دنیا نے دیکھا ہو۔ اقتدار کی تلاش میں غیر اللہ کی چوکھٹ پکڑنے کا دفاع کرنے والے ''آل عمران'' کو سورہ آل عمران میں بیان کردہ قرآن کا یہ ضابطہ سنانا ہی کافی ہے۔

اے اللہ! بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی دے اور جس سے چاہے یہ بادشاہی چھین لے، اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ تمام خیر تیرے ہی اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔، (آل عمران 26:3)

اہل پاکستان کو اب ایک اصولی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ یا تو وہ اسلام کی جان چھوڑ دیں اور ترکی کی طرح سیکولرازم کو علانیہ اختیار کر لیں۔ اس سے ان کی آخرت پر جو بھی نتائج مرتب ہوں، دنیا کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ جو جوتے انھیں پڑ رہے ہیں وہ اس شدت کے ساتھ نہیں پڑیں گے۔ کیونکہ پھر دنیا میں وہ اسلام کے نمائندے بن کر نہیں کھڑے رہیں گے۔

اور اگر ہم اسلام نہیں چھوڑنا چاہتے تو خدارا وہ منافقت چھوڑ دیں جس کی کچھ مثالیں اوپر گزریں اور ان گنت مثالیں مزید دی جا سکتی ہیں۔ اس ملک کے باسی اگر اپنی منافقت سے باز نہیں آئے، اور اس قیادت کے پیچھے چلتے رہے جو اسلام کا نام لے کر ہر شرک، ظلم، انتہا پسندی اور فرقہ بندی کو سند جواز دیتی ہے تو جلد یا بدیر ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ پھر دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ آسمان وزمین کا مالک اپنے غداروں کو کس مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

ترقی کا راستہ

دوصدی پہلے تک دنیا میں بادشاہی نظام قائم تھا۔مملکتیں بادشاہوں کی ہوتی تھیں ۔وہی اس کے مالک ہوا کرتے تھے اور ملک کے سارے وسائل ان کے قبضے میں ہوتے جنھیں وہ اپنی عیاشیوں پرخرچ کرتے تھے۔ وسائل میں سے کچھ حصہ امراء،نوابوں، جاگیرداروں میں تقسیم ہوجاتا۔جبکہ بچے کھچے وسائل عوام کے حصے میں آتے جن سے وہ بمشکل زندہ رہ پاتے۔

پھر دنیا میں نیشن اسٹیٹ کا دورشروع ہوا۔بادشاہتیں ختم ہوئیں یا صرف ایک آئینی عہدے کے طور پر باقی رہ گئیں۔ ریاست عوام کی ملکیت ہوگئی۔ جمہوری طریقے پر وہ اپنے حکمران منتخب کرنے لگے۔اس طریقے میں حکمران اچھے بھی آتے اور برے بھی۔مگر دنیا بھر کے عوام حکمرانوں سے عشق نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بری کارکردگی پر جلد یا بدیر ان کو فارغ کردیتے۔ یوں رفتہ رفتہ رد کیے جانے کے خوف سے عوامی بہبود اور ملکی ترقی حکمرانوں کا مطمع نظر بنتی چلی گئی۔

سب سے پہلے مغرب نے ترقی اورعوام کی فلاح کے اعلیٰ معیارات قائم کیے۔ذرائع ابلاغ کی ترقی کے دور میں ایک قوم کی ترقی نے دوسری قوم کے لیے بھی ایک جذبہ محرکہ کا کام کیا۔ چنانچہ مغرب کی دیکھا دیکھی مشرق میں بھی ترقی کی لہر آ گئی۔مشرق اور مشرق بعید کے ممالک نے ترقی کی راہیں طے کرنا شروع کیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جاپان، جنوبی کوریا، سنگاپور ہی نہیں بلکہ ویتنام اور تھائی لینڈ جیسے ممالک بھی ترقی کی دوڑ میں آگے نکل گئے۔

ان کے اثر سے ملائشیا اور انڈونیشیا جیسے مسلم ممالک نے اپنا سفر شروع کیا۔اُدھر یورپ کے مرد بیمار ترکی نے بھی اسی راستے پر قدم رکھ دیا۔آج اس کا شمار دنیا کے تیز ترین ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے۔ عالمی ترقی کی اس لہر کی وجہ سے عرب ممالک کی بادشاہتیں بھی مجبور ہوئیں کہ عوامی فلاح اور ترقی کی اس دوڑ میں حصہ لیں۔یو اے ای، قطر، سعودی عرب وغیرہ کی

بادشاہتوں نے بھی اپنے وسائل سے عوامی فلاح اور ترقی کے ان گنت منصوبے بنا ڈالے۔

ترقی کی اس دوڑ میں چین و ہندوستان جیسے پڑوسی جو ہم سے کہیں پیچھے تھے، بہت آگے نکل گئے۔ ان کو تو چھوڑیے بنگلہ دیش اور سری لنکا جیسے ممالک ترقی کی دوڑ میں ہم سے آگے ہیں۔ اب ہمارا کوئی موازنہ رہا ہے تو افغانستان ہی سے رہا ہے۔ ہم بہت فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم الحمدللہ ترقی کی دوڑ میں افغانستان سے آگے ہیں۔ زیادہ فخر کرنا چاہیں تو صومالیہ، موغادیشو اور کچھ اور افریقی ممالک سے موازنہ کر کے بھی اپنی ترقی پر اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں۔

تاہم کبھی کسی مغربی ملک کے سفر کا موقع ملے (جس کا امکان ایک عام پاکستانی پاسپورٹ ہولڈر کے لیے اس لیے بہت کم ہو چکا ہے کہ اسے ویزہ ملنا مشکل ہے) یا کسی مشرقی ملک ہی جانے کا موقع مل جائے تو جا کر ضرور دیکھنا چاہیے کہ دنیا کی قومیں کس طرح ترقی کرتی ہیں اور ان کے حکمران اپنی عوام کی فلاح کے لیے کیا کیا منصوبے بناتے ہیں۔

یہ سوال اگر پیدا ہو جائے تو پھر اس کا جواب بھی ڈھونڈنا چاہیے کہ ہمارا ساری دنیا سے پیچھے رہ جانے کا سبب کیا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ایک سادہ سبب بیان کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے حکمران کرپٹ ہیں۔ مگر درحقیقت یہ بات درست نہیں ہے۔ کرپشن کے الزامات تو طیب اردگان اور مہاتیر محمد جیسے لیڈروں پر بھی لگے جنھوں نے اپنے ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ پھر یہ کہ حکمرانوں نے کرپشن کی بھی ہو تو تنہا ان کی کرپشن کبھی ترقی کی راستے میں بنیادی رکاوٹ نہیں بنتی۔ پاکستان کا صرف ایک سال کا بجٹ کئی ہزار ارب کا ہوتا ہے۔ چند لیڈروں نے اگر زندگی بھر میں چند سو ارب کی کرپشن کر بھی لی تو اس سے ملک کا بیڑہ غرق ایسے نہیں ہو سکتا جیسے ہمارا ہو چکا ہے۔

ہمارا اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔ اس اصل مسئلے پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر

بربادی کے اس سفر میں ہم آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور آخرکار فطرت کا قانون حرکت میں آئے گا اور خاکم بدہن ہمارا قومی وجود ختم ہو جائے گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے سوویت یونین اپنی انتہائی طاقتور فوج اور ایٹمی ہتھیاروں کے باوجود ختم ہو گیا۔

ہمارا اصل مسئلہ ہماری سیاسی قیادت نہیں بلکہ فکری قیادت ہے جس نے پوری قوم کو انتہائی جذباتی اور منفی سوچ کا حامل بنا دیا ہے۔ ہمارے جذباتی ہونے کی ایک مثال وہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یعنی دنیا بھر میں سیاستدانوں کی زندگی چند برس ہوتی ہے۔ لوگ بحیثیت حکمران ان کا انتخاب کرتے ہیں؛ اور اس کے بعد ان کو فارغ کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں جذباتیت کا یہ عالم ہے کہ ہم سیاستدانوں سے عشق کرتے ہیں اور حد یہ ہے کہ تین تین نسلوں تک ان کو تمام تر نااہلی کے باوجود منتخب کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک شخص کسی طرح لیڈر بن جائے۔ پھر لوگ اس کے رومان میں ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ پاکستان کے ابتدائی بیس برسوں میں ہمیں پہلا قومی لیڈر بھٹو کی شکل میں ملا۔ ہم اس وقت ان کی تیسری نسل کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اگلے بیس برسوں میں دوسرا قومی لیڈر نواز شریف کی شکل میں ملا۔ ہم ان کی دوسری نسل کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اور پھر اگلے بیس برس بعد ہمیں تیسرا لیڈر عمران خان کی شکل میں ملا۔ سارے قرائن یہی ہیں کہ ایک گروہ کثیر عمران خان کے بھی عشق ہی کا شکار ہو چکا ہے۔ ہم نے اپنے جذباتی رویے کی اصلاح نہیں کی تو اگلے بیس برس بعد بھی کوئی لیڈر ملا تو قوم اسی طرح اس سے عشق کرے گی۔ جس کے بعد لیڈر تو مزے کرے گا اور قوم ذلت اور بربادی کی مزید پستیوں میں گرتی چلی جائے گی۔

جذباتیت کے ساتھ ہمارا ایک دوسرا مسئلہ ہماری وہ منفی سوچ ہے جس میں ہم اپنے دائرے میں تعمیری کام کرنے کے بجائے دوسروں پر تنقید کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔ اس کو بھی ایک سیاسی مثال

سے سمجھنا چاہیے۔

پچھلے الیکشن سے قبل عمران خان ایک بڑے قومی لیڈر کے طور پر ابھرے۔ان کی شہرت بہت اچھی اور دامن ہرطرح کی کرپشن سے پاک تھا۔ چنانچہ 2013 کے الیکشن میں لوگوں نے انھیں بہت بڑی تعداد میں ووٹ دیے۔ان کی پارٹی تحریک انصاف قومی الیکشن نہیں جیت سکی لیکن کے پی کے میں وہ حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

اس موقع پر عمران خان کے پاس دو راستے تھے۔ایک یہ کہ وہ انتخابی نتائج سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود انھیں تسلیم کرلیں۔ وہ قومی اسمبلی میں ایک بھرپور اپوزیشن کا کردار ادا کریں۔ الیکشن کے قوانین کو اس طرح تبدیل کروائیں کہ آئندہ دھاندلی کے امکانات کم سے کم ہوجائیں۔اس کے ساتھ ہی وہ کے پی کے کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ بنانے کا فیصلہ کرلیں۔ وہ پشاور میں دھرنا دے دیں۔ اپنی پوری ٹیم کو یہ بتائیں کہ اردگان کو ایک شہر استنبول ملا تھا، اس نے استنبول کو ایک بہترین شہر بنا کر پورے ملک ہی میں اقتدار حاصل نہیں کیا بلکہ اتنی عوامی تائید بھی حاصل کرلی کہ لوگ اس کے حق میں فوجی بغاوت سے ٹکرا گئے اور جان دے کر اس کی حکومت کو بچالیا۔ یہی ہمیں کرنا ہوگا۔ پانچ سال میں ہمیں کے پی کے کو ایک ترقی یافتہ علاقہ بنانا ہوگا۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد صوبوں کے پاس اتنا زیادہ بجٹ ہے کہ عمران خان جیسے آہنی عزم کے انسان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ پانچ سال میں کے پی کے کو یورپ کے برابر نہ سہی ملائیشیا اور چین کے برابر ضرور پہنچا دیتے۔

مگر چونکہ اس قوم کی تربیت برسہا برس سے منفی بنیادوں پر ہو رہی ہے جس میں لوگ اپنے دائرے میں تعمیری کام کرنے کے بجائے دوسروں پر غصہ اتارنے کو اصل کام سمجھتے ہیں، اس لیے خان صاحب نے بھی وہی کیا جو قوم کا مزاج ہے۔ یعنی پانچ سالوں میں آدھا وقت انھوں نے

دھرنے میں حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ضائع کیا اور باقی آدھا وقت پانامہ کیس کے پیچھے ضائع کیا۔اور پانچ سال بعد دونوں صورتوں میں دیکھیے کہ حاصل کیا ہوا۔

آج صورتحال یہ ہے کہ معزول نواز شریف مظلوم نواز شریف بن چکا ہے جس سے مقابلے کے لیے خان صاحب کو الیکٹ ایبلز لینے پڑ رہے ہیں۔عدلیہ جیسے محترم ادارے کا وقار خاک میں مل چکا ہے۔ ہر باشعور شخص جانتا ہے کہ بے شک لندن فلیٹ نواز شریف کی بیس پچیس سالہ پرانی کرپشن کی کمائی کا نتیجہ ہیں، مگر نواز شریف کو اس وجہ سے معزول نہیں کیا گیا،ان کی معزولی کی وجہ کچھ اور ہے۔ پاکستان کا سب سے مضبوط ادارہ فوج جو دہشت گردی کی جنگ جیتنے کے بعد مقبولیت کے عروج پر تھا،عملاً اسے ایک سیاسی پارٹی کی طرح موجودہ صورتحال میں ایک فریق سمجھا جارہا ہے۔میڈیا چینلز کی اعتباریت ختم ہوچکی ہے۔خود عمران خان کا حال یہ ہے کہ اقتدار کے لیے انھیں ان ہی الیکٹ ایبلز کو اپنی پارٹی میں لینا پڑ رہا ہے جن کے خلاف وہ جنگ کرنے اٹھے تھے۔اس کے بعد چاہے عمران خان الیکشن جیت جائیں، پاکستان کے عوام تبدیلی کی جنگ پہلے ہی ہار چکے ہیں۔

اس کے برعکس عمران خان تعمیر کے راستے پر چلتے تو کے پی کے کا صوبہ چاہے یورپ اور ملائیشیا جیسا نہ بنتا، پاکستان کے دوسرے صوبوں سے بہت زیادہ آگے نکل چکا ہوتا۔ پورے ملک سے لوگ پشاور، چارسدہ،سوات اور کالام جاتے اور واپس آکر کہتے کہ 2018 میں ہمیں ہر حال میں عمران خان کو اقتدار میں لانا ہے۔اس کے بعد 2018 میں عمران خان الیکشن میں کھمبے بھی کھڑے کرتے تو لوگ انھی کھمبوں کو جتوا دیتے۔اس لیے کہ لوگ اندھے نہیں ہوتے۔انھیں کام نظر آتا ہے۔لیکن کام نہیں ہوگا تو زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ پھر آپ کو الیکٹ ایبلز لینے پڑتے ہیں۔اپنے ہی اصولوں پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔

یہ ہے ہمارا اصل مسئلہ۔ہم اپنی زمین میں فصل اگانے کے بجائے دوسروں کو ان کی زمین کی

فصل خراب کرنے کا طعنہ دینے کو اصل کام سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ سوچ نہیں بدلتی، تب تک بڑے سے بڑا لیڈر بھی اسی قومی مزاج کا شکار ہوگا جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ پھر لوگ جذباتی ہوکر اپنے لیڈروں کا اندھا دفاع کرتے رہیں گے اور لیڈران کا استحصال کرتے رہیں گے۔ لوگ منفی اندازفکر کا شکار رہیں گے۔ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے دوسروں کو الزام دیتے رہیں گے۔ اپنے دائرے میں تعمیری کام کرنے کے بجائے دوسروں پر تنقید کرتے رہیں گے۔ اور دوسری طرف بھارت اور بنگلہ دیش کے بعد نیپال، بھوٹان اور سری لنکا بھی ہم سے آگے نکل چکے ہوں گے۔

الیکشن کا نتیجہ جو بھی نکلے، قوم اطمینان رکھے کہ کوئی تبدیلی نہیں آ رہی۔ ہمارے سارے مسائل ایسے ہی رہیں گے۔ تبدیلی تب آئے گی جب یہ جذباتیت اور منفی سوچ ختم ہوگی۔ ہمارے مسائل کا حل قوم کے رویے میں تبدیلی ہے۔ ہمیں اندھی جذباتیت سے باہر نکلنا ہوگا۔ ہمیں اپنے دائرے میں تعمیری کام پر یقین رکھنا ہوگا۔ قوموں کی زندگی میں دس بیس سال کچھ نہیں ہوتے۔ 2018 کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے 2023 بھی آجائے گا۔ لوگ اگر جذباتی بنے رہے قدرت اسی طرح انھیں سزا دے گی جس طرح آج دے رہی ہے۔ لوگ اگر اپنے دائرے میں تعمیری کام کے لیے تیار نہیں ہوئے تو قوم اسی طرح تباہ ہوتی رہے گی۔

لیکن اگر ہم نے اپنا رویہ بدل لیا تو سب کچھ بدلنے لگے گا۔ 2023 میں نہ سہی 2028 میں سہی ہمیں ایک بہتر قیادت مل جائے گی۔ اس لیے کہ جمہوری دور میں برے حکمران اچھے لوگوں پر زیادہ عرصے تک حکومت نہیں کر سکتے۔ جمہوریت میں برے حکمران صرف برے لوگوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ اچھے لوگ برے حکمرانوں کو چند برسوں میں اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ مگر یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو جذباتی اندازفکر کے بجائے معقولیت سے کام لیتے ہیں۔ جو تعمیری سوچ پر یقین رکھتے ہیں۔ جو نہ ملے ہوئے کو بھول کر ملے ہوئے کی تعمیر کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی ترقی کا راستہ ہے۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے۔

عہد یوسفی جاری رہے گا

[اردو زبان کے بے مثل مزاح نگار اور اردو زبان کے لافانی نثری شہ پاروں کے خالق مشتاق احمد یوسفی کے انتقال پر لکھی گئی تحریر، ابو یحییٰ کے قلم سے۔]

حیات یوسفی تمام ہوئی، مگر عہدِ یوسفی جاری رہے گا۔

اردو زبان جیسی خوش نصیب زبان شاید ہی کوئی اور ہو جس کے جنم پر چند صدیاں ہی گزریں اور اس کا دامن میر سے لے کر غالب، مومن سے لے کر اقبال، فیض سے لے کر فراز جیسے شاعروں اور میر امن دہلوی سے لے کر رجب علی بیگ سرور، محمد حسین آزاد سے لے کر قرۃ العین حیدر اور شبلی سے لے کر ابوالکلام آزاد جیسے ادیبوں اور نثر نگاروں سے آراستہ ہو چکا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی ہستی اردو زبان کی اس خوش قسمت تاریخ میں ایک اور شاندار باب کا نام ہے۔ میرا مشتاق احمد یوسفی صاحب سے پہلا باقاعدہ تعارف اردو کے معروف نقاد اور مزاح نگار مشفق خواجہ کے اس تبصرے سے ہوا جو انھوں نے یوسفی کی کتاب آب گم پر کیا تھا۔ مشفق خواجہ اپنے مشہور ادبی کالم خامہ بگوش کی وجہ سے برصغیر کے ادبی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ وہ ایک بڑے ناقد تھے۔ اس لیے ہر شاعر اور ادیب انھیں اپنی کتاب بھیجتا تھا۔ اس پس منظر میں مجھے آج بھی ان کا ایک جملہ نہیں بھولتا۔ میں ان سے ملاقات کے لیے ناظم آباد میں واقع ان کے گھر پہ حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے کتب خانہ میں موجود ہزارہا کتابوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا تھا کہ یہ اردو کے ہزاروں شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کا قبرستان ہے جن کا پوسٹ مارٹم انھوں نے کیا۔

مشفق خواجہ نے آب گم کے بارے میں کہا تھا کہ پچھلے سو برسوں میں اردو ادب میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مشفق خواجہ جیسا ناقد اگر کسی کتاب کے بارے میں یہ جملہ کہہ دے تو یہی اس کتاب کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے بڑے اشتیاق سے وہ کتاب

خریدی۔ اس کے بعد کتنی دفعہ اس کتاب کو پڑھا، کتنی دفعہ اسے پڑھتے ہوئے بے اختیار ہنسی چھوٹی، کتنی دفعہ اداس ہوگیا، کتنی دفعہ ان کے کرداروں کے ساتھ ماضی کا حصہ بن گیا؛ اس کی گنتی تو مجھے یاد نہیں۔ لیکن میں نے مشفق خواجہ کی اس بات کو ہمیشہ درست پایا ہے کہ اردو زبان میں اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی۔

تاہم میں اسے اپنی بدقسمتی ہی سمجھتا ہوں کہ میں نے پہلے آب گم پڑھ لی۔ کیونکہ اس کے بعد خود یوسفی صاحب کی دیگر کتب جو اپنی ذات میں بڑی غیر معمولی ہیں، آب گم کے آگے اپنا مقام گم کر دیتی ہیں۔ گو کہ یوسفی صاحب نے کم ہی لکھا اور جو لکھا منتخب لکھا۔ اوسط لگائیں تو اپنے دور تصنیف میں ان کی ایک کتاب آٹھ دس برس بعد ہی سامنے آتی تھی۔ چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگشت اور آب گم کئی عشروں میں جا کر سامنے آئیں، مگر آب گم جیسا کوئی نہیں۔

آب گم سن نوے میں شائع ہوئی۔ شاید یوسفی صاحب کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس سے بڑھ کر شاہکار نہیں لکھا جا سکتا۔ چنانچہ اس کے بعد ہر محفل میں لوگ ان سے پوچھتے رہے کہ اگلی کتاب کب آ رہی ہے، مگر انھوں نے مزید کوئی کتاب نہیں لکھی۔ کچھ برس قبل سامنے آنے والی شام شعر یاراں جو ان کے مضامین کا انتخاب ہے، یہ کتاب ان کا انتخاب نہیں، پبلشر کے اصرار کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس زمانے میں خرابی صحت کا شکار ہو چکے تھے۔ یوسفی صاحب تو لکھ کر پال ڈال دینے والے آدمی تھی۔ برسوں بعد لکھا ہوا پسند آتا تو عوام کے سامنے لے آتے ورنہ بے دریغ اپنی محنت کو رد کر دیتے۔ یہی ان کی کامیابی کا ایک اہم راز تھا۔

یوسفی صاحب کو لوگ عام طور پر مزاح نگار کے طور پر جانتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے یہی ان کی وجہ شہرت ہے۔ مگر میں نے ان کو اتنا ہی موثر سنجیدہ ادب تخلیق کرنے والا پایا ہے۔ اس پہلو سے بھی ان کی تحریر اتنی بلیغ ہے کہ سمجھنے والے کے دل میں اتر جائے۔ اس کی ایک مثال آب گم

سے دیکھیے ۔اپنے ایک عزیز دوست کے حوالے سے وہ کمال خوبصورتی سے یہ بتاتے ہیں کہ جوانی کی طاقت ہو، علم وفضل کا ذوق ہو، فتح وکامرانی کا دور ہو یا دولت کی فراوانی؛ بڑھاپے، بیماری اور موت کے مقابلے میں یہ سب کس طرح بے کسی کی تصویر بن کر بے معنی ہو جاتے ہیں۔

’’میاں احسان الٰہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی دُلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے۔دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کندہ) مردہ نیل گائیں کی تھوتھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔دونوں تصویروں کے نیچے رکھی ان کی نئی ان ویلڈ چیئر (معذوروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔اس کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں سجی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔‘‘

یہ یوسفی کے کلام کی بلاغت ہے کہ چند جملوں میں بظاہر کمرے کا نقشہ کھینچا ہے لیکن دراصل انسانی زندگی کے اصل المیوں کا نقشہ اس کمال سے کھینچا ہے کہ قاری غیر محسوس طریقے پر انسانی زندگی کی بے ثباتی اور متاع دنیا کی بے وقعتی کے احساس کو اپنے اندر اترتا محسوس کرتا ہے۔ یہ اسلوب، یہ بلاغت، یہ تاثیر یوسفی کی تحریر میں جگہ جگہ ہے، مگر بدقسمتی سے بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے یوسفی کو اس پہلو سے پڑھا یا سمجھا ہو۔ میں نے اس پہلو پر خاص طور پر اس لیے توجہ دلا دی کہ ادب کے طالب علموں کے لیے اس سے تحقیق کے کئی راستے کھل سکتے ہیں۔

ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر یوسفی صاحب کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ ان کی خوبصورت نثر نے مزاح کا جامہ زیب تن کر کے اس روایت کو آگے بڑھایا جس کی بنیاد فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی نے رکھی اور جسے پطرس بخاری جیسے مزاح نگاروں نے بام عروج بخشا۔ یوسفی صاحب کے دور میں ابن انشاء اور شفیق الرحمٰن جیسے نامور مزاح نگار موجود تھے، مگر جو مقبولیت ان کے حصے میں

آئی وہ بڑی غیر معمولی تھی۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہماری قوم مردہ پرست ہے۔ مگر یوسفی صاحب کی حیات ہی میں ان کی مقبولیت اور قدر و قیمت نے اپنا عروج دیکھ لیا تھا۔

ادبی قد و قامت کے علاوہ یوسفی صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بھی بڑی وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ میں پہلی دفعہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ ان سے ملنے گیا تو پہلی ملاقات ہونے کے باوجود اجنبیت کا کوئی احساس تک نہ ہوا۔ اس ملاقات کو بہت برس ہو گئے، مگر ابھی بھی یاد ہے کہ ان کی اہلیہ (جن کا انتقال کچھ عرصہ قبل ہوا) ہمارے لیے چائے کی پوری ٹرالی سجا کر لائیں۔ ہم رخصت ہوئے تو الوداع کہنے کے لیے گھر سے باہر آ کر اُس وقت تک ہاتھ ہلاتے رہے جب تک ہماری گاڑی موڑ مڑ کر نگاہ سے اوجھل نہ ہو گئی۔ انھوں نے تحریر کے حوالے سے مجھے کئی مشورے بھی دیے جو آج تک میں نے گرہ میں باندھ رکھے ہیں۔

یوسفی صاحب رخصت ہو گئے۔ یہ المیہ نہیں ہے، اس لیے کہ ہر انسان کو رخصت ہونا ہے۔ فنا سے پاک صرف اسی الحی القیوم کی ہستی ہے جو زندگی کا خالق ہے۔ میرے نزدیک اصل المیہ یہ ہے کہ جو اردو زبان یوسفی صاحب نے لکھی ہے، اس کو سمجھنے والی نسل بھی رخصت ہو رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگلی نسل میں کتنے لوگ ہوں گے جو یوسفی صاحب کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے۔ لیکن یہ توقع ضرور ہے کہ جو شخص ان کی لکھی ہوئی نثر کا مطالعہ کرنے کا ذوق پیدا کر لے گا، وہ جمال اور لطافت کی ایک نئی دنیا میں پہنچ جائے گا۔ وہ احساس اور مسکراہٹ کے ایسے منفرد زاویے دریافت کر لے گا جن سے وہ پہلے کبھی واقف نہیں تھا۔ وہ عام انسانوں کو بنیاد بنا کر لکھی گئی وہ خاص تحریریں پڑھے گا جن کو دنیا کی کسی بھی زبان کے شاہکاروں کے مقابلے میں بڑے فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حیات یوسفی تمام ہوئی، مگر عہدِ یوسفی جاری رہے گا۔

ابو یحییٰ

چوتھا صنعتی انقلاب یا آٹومیشن ایج

وہاٹس ایپ پر ایک ویڈیو دیکھنے کا موقع ملا۔اس وڈیو میں بتایا گیا تھا کہ سن 2050 میں دنیا بھر کے ممالک کے لوگوں کی زندگی اور لائف اسٹائل کس قسم کا ہوگا۔اس میں ٹیکنالوجی کی معراج کو دکھایا گیا تھا کہ کس طرح لوگ جدید ٹیکنالوجی کے سہارے زندگی کو بہتر سے بہتر بنا چکے ہوں گے۔ویڈیو کے آخر میں پاکستان کو دکھایا گیا تھا جہاں پریشان حال لوگ بجلی کے آنے کا انتظار کررہے تھے۔

یہ بظاہر ایک لطیفہ ہے،مگر ہمارے ہاں لوگ ابھی تک جن سیاسی ،سماجی ، مذہبی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، یہ ان کا ایک بہترین بیان ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جن مسائل سے بیشتر دنیا پچھلی صدی میں نمٹ چکی ہے، وہ آج تک ہمارے لیے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ مقبول کرنٹ افیئرز یا حالات حاضرہ کے پروگرام ہیں۔اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے حال کے مسائل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے کہ لوگ اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔

ایسے میں جب ہمارے وزیراعظم نے اپنے حالیہ دورہ چین میں ایک تقریر میں چوتھے صنعتی انقلاب کی آمد کا ذکر کیا تو بیشتر لوگ اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ چوتھا صنعتی انقلاب کس بلا کا نام ہے۔جو لوگ کسی درجہ میں اس سے واقف ہیں وہ بھی ان مضمرات کو نہیں سمجھتے جو آنے والا زمانہ اپنے ساتھ لے کر آرہا ہے۔آج میرے پیش نظر یہ ہے کہ ان چیزوں پر کچھ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرلی جائے۔

صنعتی انقلاب اوراس کے اثرات

چوتھے صنعتی انقلاب کو سمجھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ صنعتی انقلاب کیا ہے۔ انسانی تاریخ کے آغاز میں انسانوں کے پاس خوراک کے حصول کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ وہ جانوروں کا شکار کریں اور پھل پودوں کو جمع کر کے اپنی زندگی کا نظام چلائیں۔ اس دور کو عہد شکار یا انگریزی میں Age of Hunter-Gatherer کہا جاتا ہے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد انسانوں نے بڑے پیمانے پر پودوں کو خود بونا اور فصل کاٹنا سیکھا تو زرعی دور شروع ہوا۔ اس کے بعد تین صدی قبل صنعتی انقلاب آیا جب انسانوں نے مشین کو ذریعہ معاش بنالیا۔

ان میں سے ہر دور کے اپنے اثرات اور نتائج تھے جو انسانی سماج اور افراد پر مرتب ہوئے۔ یہ اثرات و نتائج اپنی ذات میں ایک تفصیلی موضوع ہے لیکن سمجھانے کے لیے ایک مثال عرض کررہا ہوں کہ عہد شکار اور عہد زراعت میں ان ادوار کے تقاضوں کی بنا پر مرد و عورت کا دائرہ کار اور تعلقات کا ایک خاص ڈھانچہ وجود میں آیا۔ ان دونوں ادوار میں چونکہ حیوانی طاقت ہی اصل معیار قوت تھا اس لیے عورت کی سماجی حیثیت بہت کمزور ہوگئی اور اس کا دائرہ کار بہت محدود ہوگیا۔ صنعتی انقلاب میں چونکہ حیوانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت نے لے لی اس لیے خواتین کی حیثیت بدلنا شروع ہوئی اور اب اس انفارمیشن ایج میں عورتوں کی حیثیت میں بہت فرق آچکا ہے۔ اپنے معاشرے کو تو چھوڑیے خود ٹھیٹھ مذہبی معاشروں، جیسے سعودی عرب میں بھی ہر جگہ مردوں کے ساتھ خواتین ملازمتوں پر نظر آتی ہیں۔ ان اثرات کی ایک اور مثال ریل کی ایجاد ہے جس نے نہ صرف صنعتی دور میں سفر کے تصور کو بدل کر رکھ دیا بلکہ باہمی تعلقات، رابطوں، رہائش اور آبادی کے معاملات کو بدل ڈالا۔ اسی طرح صنعتی دور میں شہروں کی طرف بڑی تعداد میں ہجرت نے بہت سی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔ اس طرح کی اور بہت سی

مثالیں موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ صنعتی دور ذرائع پیداوار میں تبدیلی ہی کا نام نہیں بلکہ اس کے کہیں زیادہ گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

تاہم اصل بات یہ بیان کرنا مقصود تھی کہ صنعتی انقلاب نے دنیا میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کردی اور مشین نے حیوانی طاقت کی جگہ لے لی۔ یہ پہلا صنعتی انقلاب تھا جس میں اسٹیم انجن کی طاقت سے مشین چلتی تھی۔ دوسرا صنعتی دور وہ تھا جس میں اسٹیم انجن کی جگہ بجلی نے لے لی اور بڑے پیمانے پر خودکار مشینوں نے پیداواری عمل کو بہت تیز اور پیداوار کو سستا کردیا۔ تیسرا صنعتی دور وہ تھا جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب کمپیوٹر کی ایجاد نے نہ صرف پیداواری عمل کو مزید بہتر بنادیا بلکہ خود ایک نئے دور کا آغاز کردیا۔ یعنی انفارمیشن ایج کا جس کے نتیجے میں پوری دنیا حقیقی معنوں میں ایک گلوبل ویلج بن گئی۔

اس انفارمیشن ایج کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر لوگ جو ابھی تک عملی طور پر باقی دنیا کے برعکس زرعی دور میں جی رہے تھے، تیزی سے جدید دنیا سے متاثر ہونے لگے۔ ہمارے معاشرے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوگیا جو یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور عہد روشن خیالی کے دور میں شروع ہوا تھا۔ جو عمل وہاں صدیوں میں ہوا تھا یہاں اب عشروں میں وہ عمل پورا ہورہا ہے۔

چوتھا صنعتی انقلاب کیا ہے؟

ایسے میں دنیا جس چوتھے صنعتی دور میں داخل ہورہی ہے، اس کے اثرات بھی بہت گہرے اور ہمہ گیر ہوں گے۔ مگر پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ چوتھا دور ہے کیا۔ یہ چوتھا صنعتی دور وہ ہے جس میں مصنوعی ذہانت (AI) اور روبوٹکس کی ترقی کے بعد مشینیں ہماری زندگی کا عملی نظام سنبھالنا شروع کریں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان گنت آلات کے ساتھ ہمہ وقت بذریعہ

انٹرنیٹ پوری دنیا سے جڑے ہوئے ہوں گے۔اس کی ایک سادہ ترین مثال آٹو میٹک کار ہے جس میں مسافر صرف اپنی منزل کی نشاندہی کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے گا اور کار خود بخود اس کی منزل مقصود پر پہنچ کر رک جائے گی۔یہ مشینیں ہمارے دفاتر اور گھروں کا ہی نظام نہیں سنبھالیں گی بلکہ خود نینوٹیکنالوجی کی مدد سے ہمارے کپڑوں اور جسم کے اندر تک نصب ہو کر ہمارے بہت سے کام کر رہی ہوں گی۔نینوٹیکنالوجی کا نام جن لوگوں کے لیے نامانوس ہے ان کے لیے اس کی وضاحت کرتا چلوں کہ یہ ایٹم اور مالیکیول کی سطح پر جا کر مادے سے انتہائی چھوٹی مصنوعات بنانے کا عمل ہے۔نینو میٹر کا مطلب ہوتا ہے کہ ایک میٹر کا ایک ارب واں حصہ۔اخبار کے ایک صفحے جیسی پتلی چیز جس کی موٹائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، اس میں ایک لاکھ نینو میٹر آسکتے ہیں۔چنانچہ اس ٹیکنالوجی میں اتنی چھوٹی سطح پر مصنوعات بنائی جارہی ہیں اور انھیں دیگر مادے کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے جہاں وہ بہت سے کام کرتی ہیں۔مثلاً نینوٹیکنالوجی کی مدد سے ایسے شیشے بنائے جارہے ہیں جس میں موجود نینو ذرات شیشے پر پڑنے والے پانی کو خود صاف کر دیتے ہیں۔یوں شیشہ پانی سے دھندلا نہیں ہوتا بلکہ بارش کا پانی برسنے کے باوجود کھڑکیاں ایسے صاف رہتی ہیں جیسے ان کو کپڑے سے صاف کیا گیا ہو۔اب آپ ایسے گھر کا تصور کیجیے جہاں آپ اپنے گھر کی بند کھڑکیوں کے صاف شیشوں سے باہر کی بارش سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔بارش کا پانی کمرے میں آ کر اندر کی چیزوں کو خراب نہ کرے، اس مقصد کے لیے آپ نے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیا، مگر وہ پانی سے دھندلا نہیں رہا۔اسی طرح اس ٹیکنالوجی سے ایسے کپڑے بھی بنائے جارہے ہیں جن پر داغ دھبے نشان نہیں چھوڑ پاتے۔یا ہسپتالوں اور گھروں میں صفائی کے لیے ایسے کپڑے بنائے جارہے ہیں جو کسی قسم کے جراثیم کی فوراً نشاندہی کر دیں گے۔

چوتھے صنعتی دور کے اثرات

اس نئے دور کے اثرات اتنے گہرے اور ہمہ جہتی ہوں گے جن کا ادراک بھی کرنا اس وقت مشکل ہے۔ ہمارے ہاں تو لوگ ابھی تک صنعتی اور انفارمیشن ایج کے اثرات کو پوری طرح نہیں سمجھ پارہے تو آنے والے دور جسے میں آٹومیشن ایج کہتا ہوں، اس کے اثرات کو سمجھنا یا ان کی تیاری کی توقعات باندھنا کوئی عقلمندی نہیں۔ لیکن میرے لیے ان چیزوں کی وضاحت اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ دین اور اس کی دعوت پر اس آنے والے دور کے انتہائی گہرے اثرات پڑنے والے ہیں۔ اس لیے کہ دین فکری سطح پر لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور سماجی سطح پر لوگوں کی تربیت کرتا ہے۔ اس لیے ان دونوں سطحوں پر آنے والے عشروں میں سنگین مسائل پیدا ہونے جارہے ہیں۔ گرچہ چوتھے صنعتی دور کے اثرات کا اصل دائرہ تو معیشت، پیداوار، وسائل کی تقسیم وغیرہ ہی ہے۔ لیکن ان کا آخری اثر فکری اور سماجی سطح پر ہوگا۔ اس لیے ان کا ادراک ضروری ہے۔

میں ایک مثبت ذہن کا شخص ہوں۔ اس لیے اس پہلو کو بہت مثبت نظر سے دیکھتا ہوں کہ انفارمیشن ایج اور گلوبل ویلج میں جینے کی بنا پر ہمیں آنے والے دور کی پہلے سے اطلاع ہو چکی ہے۔ ورنہ جس وقت دنیا میں صنعتی انقلاب آیا، ہمیں اس واقعے کی خبر تک نہیں ہو سکی۔ اور خبر اس وقت ہوئی جب ہزاروں میل دور سے آئے مٹھی بھر انگریزوں نے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں حاصل ہونے والی طاقت کی بنا پر پورے برصغیر کو اپنا غلام بنالیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری نادان فکری قیادت آج کے دن تک ہمیں یہ سبق پڑھاتی ہے کہ یہ کچھ غدار تھے جن کی غداری نے ہندوستان کو پلیٹ میں رکھ کر انگریزوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ورنہ ان کی مجال تھی کہ ہندوستان میں ہمارے اقتدار کا خاتمہ کرتے۔

آج کے دن تک ہمارے ہاں اسی فکری قیادت کا غلبہ ہے، اس لیے اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ کوئی معقول بات آج بھی سنی جا سکے گی۔ البتہ یہ خوش قسمتی ہے کہ اب سیاسی قبضوں کا دور نہیں رہا، اس لیے اس بات کا اندیشہ تو قدرے کم ہے کہ ہم سیاسی طور پر مغلوب ہوں گے لیکن قوی امکان یہی ہے کہ تیسرے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں تہذیبی طور پر اور چوتھے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں معاشی اور سماجی طور پر ہم مکمل مغلوبیت کا شکار ہونے جا رہے ہیں۔

گرچہ اگر کوئی معجزہ ہو جائے اور ہمارے ہاں کوئی ایسی معقول قیادت پیدا ہو جائے جو تعلیم کی اہمیت سے واقف ہو تو صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔ ورنہ یہ کم و بیش طے ہے کہ آنے والے دور میں جاہل اقوام کا مقام وہی ہوگا جو گاؤں دیہاتوں میں کمی کمینوں کا ہوتا ہے اور دنیا کے وسائل میں ان کا حصہ سب سے کم ہوگا۔

میں سردست آنے والے دور کے سیاسی اور معاشی معاملات پر گفتگو نہیں کر رہا، یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ صرف اشارتاً یہ عرض کر رہا ہوں کہ پاکستان اور پورے عالم اسلام کا بیشتر انحصار تین چیزوں پر ہے۔ انسانی آبادی، پٹرول اور زراعت۔ آنے والے برسوں میں ان تینوں میں سے پہلی دو چیزیں روبوٹس اور الیکٹرک گاڑیوں کی بنا پر بے وقعت ہو جائیں گی اور رہی زراعت تو جینیٹک انجینئرنگ کی ترقی کے نتیجے میں زرعی پیداوار پر مکمل طور پر ترقی یافتہ ملکوں کا کنٹرول ہو جائے گا۔ لیکن اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہوئے میں سردست صرف سماجی اور فکری تبدیلیوں پر کچھ بات کروں گا۔

سماجی اور فکری تبدیلیاں

سب سے پہلی فکری تبدیلی کو لیتے ہیں۔ مذہبی پہلو سے انسانی تاریخ کے تین ادوار ہیں۔ ایک دور شرک جس میں شرک دنیا کی غالب اقوام کی فکر کا مرکزی خیال تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس

میں تمام انبیا تشریف لائے۔ دوسرا دورتوحید کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شروع ہوا۔اور تیسرا دورالحاد کا ہے جو صنعتی انقلاب کے بعد شروع ہوااورآج تک جاری ہے۔ یہ آخری دورفکری طور پر خدا کے بغیر کائنات کو سمجھنے کا نام ہے اور عملی طور پر خدا سے بے پروا ہوکر زندگی گزارنے کا نام ہے۔ پہلے انفارمیشن ایج نے اس انکار خدا کے تصور کو ہمارے ہر گھر میں پہنچادیا ہے۔آنے والا آٹومیشن ایج کا دور مادے اور مشینوں پر انسانوں کا انحصار اتنا زیادہ بڑھادے گا کہ اکثر لوگوں کو خداوآخرت کی پرواہی نہیں رہے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا تصور انسانی فطرت میں گرچہ ازل سے ہے، مگر عالم اسباب میں دو چیزیں اس تصور کو زندہ رکھتی ہیں۔ایک یہ کہ ہر نعمت اس خدا کی عطا ہے جو اسباب سے بلند ہے اور دوسرا ہر مصیبت وہ خدا ٹال سکتا ہے جو تمام تر اسباب سے بلند ہے۔آنے والا دور اسباب پر انسان کا انحصار اتنا زیادہ بڑھادے گا کہ فکری طور پر خدا کے تصور کی نفی نہ کی جاسکے، مگر نفسیاتی طور پر لوگ خودکو خدا کی ضرورت سے بے نیاز سمجھنے لگیں گے۔ یوں خدا کا فکری انکار کوئی نہ بھی کرے تب بھی عملی طور پر لوگ اس سے بے نیاز ہوکر زندگی گزاریں گے۔صبح سے شام تک لوگوں کو پیسے کمانے اور مختلف تفریحات میں اسے خرچ کرنے سے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ وہ زندگی کے بلند تر حقائق پر کچھ غور کرسکیں۔

اس فکری عمل کو بدلتے ہوئے سماجی حالات سے تقویت ملے گی۔ ہماری ہر اگلی نسل جو آٹومیشن ایج میں پیدا ہوگی اپنے تصورات اور مشاہدات کے لحاظ سے بالکل جدا ہوگی۔مثلاً اگلی نسلوں کی بچیاں یہ دیکھیں گی کہ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود صرف اپنی ذہنی صلاحیت کی بنیاد پر وہ ہر میدان میں مردوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔آٹومیشن ایج میں ہر عورت اپنا کمائے گی اور وہ معاشی طور پر مردوں پر منحصر نہیں رہے گی۔اس سے بڑھ کر اب ہر جگہ اسے مشینوں کی مدد حاصل ہوگی جو اس کی انگلیوں کے اشارے پر ناچ رہی ہوں گی۔ وہ ان مشینوں کے سہارے ہر میدان

میں مردوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرلے گی۔ جس کے بعد بہت سے مروجہ تصورات اپنی جگہ کھودیں گے۔

اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے آج سے چند عشروں بعد کے اس دور کا تصور کیجیے جب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون اپنے آفس سے اٹھے گی اور اپنی خودکار زمینی یا ہوائی گاڑی (یہ دونوں چیزیں ایجاد ہوچکی ہیں) میں بیٹھ کر صرف ہوم کا لفظ بولے گی اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ جائے گی۔ یہ بے آواز گاڑی اسے آرام سے اس کے گھر پہنچادے گی۔ گھر کے دورازے پر پہنچ کر وہ اپنی آنکھیں جھپکائے گی اور گھر کا خودکار دروازہ اس کی آنکھوں سے بطور مالکن اسے شناخت کرکے خودبخود کھل جائے گا۔ گھر کے اندر اس کا روبوٹ اس کا استقبال کرنے کے لیے موجود ہوگا جو اس کے ہاتھ میں موجود چیزیں لے کر ان کی جگہ پر رکھے گا اور اس کے لیے چائے یا کافی تیار کرکے اسے فوراً پیش کرے گا۔ ساتھ ساتھ اس کے شوہر اور بچوں سے متعلق ضروری معلومات، فون کالز وغیرہ کی تفصیل اور دیگر ضروری اطلاعات بھی فراہم کرے گا۔ یہ روبوٹ اس کے سارے کام کرنے کے علاوہ ہر پہلو سے اس کا تحفظ کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ آٹومیشن اتیج اپنے دامن میں کیا کچھ امکانات لیے آرہی ہے۔ ہم نے جو مثال بیان کی ہے ان میں سے بیشتر چیزیں ایجاد ہوچکی ہیں۔ اب صرف ان کے عمومی استعمال کی بات ہے کہ اس میں کتنا عرصہ لگتا ہے۔ جزوی تبدیلیوں کے ساتھ دنیا اسی مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

حالات کے اثر سے افکار کی تبدیلی

میں اپنی بات کو سمجھانے کے لیے ایک مثال قارئین کے سامنے رکھتا ہوں جس سے انھیں اندازہ ہوگا کہ حالات کی ایک مار کس طرح انسانوں کو بدلتی ہے۔ ہم نے اپنے بچپن بلکہ نوجوانی

تک تصویر کے موضوع پر زبردست علمی اور فکری مباحث سنے تھے۔ مذہبی فکر کا سارا زور اس بات کو منوانے پر تھا کہ تصویر حرام ہے۔ مگر اس کے بعد انفارمیشن ایج کا آغاز ہوا جس کی بنیاد ہی تصویر پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اب یہ ساری بحث بالکل غیر متعلق ہو چکی ہے۔ ہر عالم اطمینان کے ساتھ تصویر کھنچواتا ہے اور مجبوری میں نہیں بلکہ اکثر شوق سے ٹی وی پر اہل علم آتے ہیں اور فیس بک پر تصویریں لگاتے ہیں۔ رہی تصویر کی حرمت کے مباحث تو اب وہ صرف تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جو نئی نسل پروان چڑھے گی اس کے خواب وخیال میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ کبھی تصویر بھی ہمارے ہاں حرام ہوا کرتی تھی۔

اس جیسی ان گنت تبدیلیاں زمانہ اور حالات کے زیر اثر آنا شروع ہوں گی۔ مجھے اس میں تو کوئی معمولی سا بھی شک نہیں ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم جو اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لائی ہوئی ہدایت یعنی قرآن کریم میں پیش کی ہے وہ ہر زمانے کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ہر زمانے سے واقف رب کریم کی ہدایت ہے۔ لیکن اس کے برعکس مروجہ مذہبی فکر جس چیز کو دین کے نام پر پیش کرتی ہے، یہ بات یقینی ہے کہ ان میں سے ہر چیز کو اپنی جگہ چھوڑنی ہو گی۔ کیونکہ اس کی بنیاد انسانی فہم ہے اور زمانے کے سیلاب کے سامنے کوئی انسانی فہم نہیں ٹھہر سکتا۔

دو مثالیں

تاہم یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ جب کچھ تصورات کو عین مذہب بنا کر پیش کیا جا رہا ہو اور وہ حالات کے تقاضوں کے سامنے اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں تو بات صرف ان اصولوں تک نہیں رہتی۔ بلکہ خود دین اور اس کی تعلیم کے حوالے سے ایک نوعیت کا عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے اوپر خواتین کی جو مثال دی ہے، وہ یہی سمجھانے کے لیے دی ہے کہ آج خواتین کے

حوالے سے بہت سی وہ باتیں جو عین دین سمجھ کر پیش کی جاتی ہیں، جلد یا بدیر ان میں سے بیشتر کو حالات کے دباؤ کے تحت اپنی جگہ چھوڑنا ہوگی۔ مگر یہ چیزیں اپنی جگہ چھوڑتے چھوڑتے خود دین پر عدم اعتماد کا سبب بن سکتی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین عالم کے پروردگار کا عطا کردہ ہے۔ یہ دین اگر ایک قدیم قبائلی سماج میں قابل عمل تھا تو جدید ترین سماج میں بھی قابل عمل ہے۔ یہ زرعی دور میں دین کامل تھا تو انفارمیشن اور آٹومیشن ایج میں بھی دین کامل ہی رہے گا۔

چنانچہ ایسے میں دین کی وہی تعبیر زمانے کے سیلاب کا مقابلہ کر سکے گی جس کی بنیاد قرآن مجید پر رکھی جائے گی۔ قرآن مجید ہمارے دین کا بنیادی ماخذ ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی مستند ترین کتاب ہے جو ہر طرح کی تحریفات سے پاک خدا کے اپنے کلام کے طور پر ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ کتاب کس طرح ہمارے زمانے کے لیے بھی موزوں ہے، اس کو اوپر ہی کی دو مثالوں سے سمجھیں۔ یعنی تصویر اور خواتین کے معاملے کی مثال سے۔

تصویر کے متعلق قرآن مجید کی تعلیمات کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید براہ راست اس کو موضوع بحث نہیں بناتا ہے۔ البتہ بالواسطہ طریقے پر دو پہلوؤں سے اس معاملے پر روشنی ڈالتا ہے۔ قرآن میں کچھ مجسمے یا تماثیل زیر بحث آئے ہیں جو مشرکانہ نوعیت کے تھے۔ قرآن ان کی سخت مذمت کرتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سورہ سبا میں حضرت سلیمان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ جنوں سے دیگر چیزوں کے علاوہ تماثیل یا مجسمے بھی بنواتے تھے۔

چنانچہ اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصویر یا مجسمے جو شرک یا ایمان و اخلاق کی کسی اور خرابی کا باعث بنیں حرام ہیں۔ لیکن جن میں ایسی کوئی قباحت نہ پائی جائے، ان پر دین کو کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بات دین کی مجموعی تعلیم کے عین مطابق ہے جس میں اصل اہمیت ایمان و

اخلاق کے مطالبات کو حاصل ہے۔قرآن کی روشنی میں جب ان روایات و آثار کا مطالعہ کیا جائے گا جن میں تصاویر کی حرمت بیان کی گئی ہے تو ان کی درست ترین توجیہہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ حضور نے جن تصاویر کی شناعت بیان کی وہ مشرکانہ نوعیت کی تصاویر تھیں۔اس کے برعکس جاندار یا بے جان کی تصویر کے فرق کی بنیاد پر توجیہہ کی جائے گی یا جیسے اس دور میں پینٹنگ کی طرح مستقل اور عکسی اور عارضی تصاویر میں امتیاز کر کے عکسی تصاویر کے جواز کی کوشش کی گئی ہے تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔اس لیے کہ اول تو مستقل تصاویر بنانا بھی اب روزمرہ کا کام ہو چکا ہے جس سے بچا نہیں جا سکتا۔دوسرے یہ کہ بہت سی عکسی تصویریں جیسے انٹرنیٹ پورنوگرافی عکسی ہونے کے باوجود ناجائز رہتی ہیں۔کیونکہ اصل وجہ حرمت عقیدے یا اخلاق کی خرابی ہے۔چاہے وہ فائن آرٹ کے مجسمے میں ہو، عام تصویر میں ہو یا انٹرنیٹ اور ٹی وی کی تصویریں ہوں۔قرآن مجید کے اصول کو اختیار کرنے کی صورت میں عملی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا لیکن اس سے ہٹ کر سوالات کا سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح خواتین کے معاملے میں ہمارے ہاں مروجہ فقہی آراء کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی گواہی حدود کے جرائم جیسے قتل، زنا وغیرہ میں سرے سے قابل قبول نہیں۔یہ آدھی پوری کا معاملہ نہیں ہے۔حدود میں سرے سے عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں۔اس بات کی کوئی اساس بھی قرآن مجید میں نہیں۔حتیٰ کہ احادیث میں بھی نہیں ہے۔قرآن نے سوائے زنا کے کسی اور معاملے میں گواہی کا کوئی ضابطہ بیان نہیں کیا بلکہ اسے زمانے اور تمدن پر چھوڑ دیا ہے۔چنانچہ فرد کی شہادت سے لے کر ڈی این اے، کیمرے، فنگر پرنٹس جس چیز پر قاضی مطمئن ہو جائے، اس پر فیصلہ ہو جائے گا۔قرآن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔عقلی طور پر بھی معلوم ہے کہ ہر دور میں جرم کے ثبوت کے طریقے الگ ہو سکتے ہیں۔چنانچہ قرآن کی تعلیم ہمیشہ قابل عمل ہے۔لیکن قرآن

سے ہٹ کر جب بھی معاملہ ہوگا وہ نئے حالات میں قابل عمل نہیں رہے گا۔

دین کے بارے میں یہ سارے مسائل اس نئی نسل کے سامنے جب آئیں گے جو دین کے نام پر دھرنوں اور دہشت گردی کو دیکھتے ہوئے جوان ہوئی ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین کے خلاف کیسی بغاوت جنم لے سکتی ہے اور جنم لے رہی ہے۔

کرنے کا کام

ایسے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ علمی محاذ پر قرآن مجید کی بنیاد پر دین پہ غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھا جائے، کیونکہ ایک روایت کے مطابق جو بعض محققین کے نزدیک سیدنا علی کا ایک قول ہے، قرآن مجید کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ یہی کتاب ہر دور کے چیلنجوں کا بہترین جواب ہے۔

کرنے کا دوسرا کام اسلام کی اصل دعوت یعنی ایمان و اخلاق کو اعلیٰ ترین اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ آج کا انسان قرآن کی اس تعلیم کو سمجھنے کے لیے زیادہ بہتر انداز میں تیار ہے۔ ہمارے نزدیک تو موجودہ دور کو لانے میں بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی حکمت ہے۔

اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہیں، موجودہ دور اور آنے والا دور ان کی مرضی کے بغیر نہیں آ رہا۔ یہ ان کی اس اسکیم کا حصہ ہے جس کے تحت دنیا اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس دور کو پیدا کیے جانے کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ انفارمیشن ایج کے اس دور میں ان کا پیغام پوری دنیا کے ہر ہر انسان تک پہنچ جائے۔ دوسرا یہ کہ جس جنت کا وعدہ انھوں نے اپنے نیک بندوں سے کیا ہے، اس آنے والے آٹومیشن دور میں اس کا ایک ادنیٰ سا عملی نقشہ لوگوں کو دکھا دیا جائے۔ دوسری طرف انسانیت الحادی فکر کے علاوہ ان اقدار کو اصل اقدار مان چکی ہے جن کو خود قرآن اپنی بنیاد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یعنی عدل، احسان کا فروغ اور ظلم و حق تلفی کا خاتمہ۔ صرف

ذات باری تعالیٰ اور فواحش کے معاملے میں ہمارا اور انسانیت کا اختلاف ہے۔ پہلی چیز اگر دنیا مان لیتی ہے تو دوسری منوانا بھی آسان ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ آج کا انسان قرآن مجید کے ان دلائل کو سننے اور ماننے کے لیے تیار ہے جو سرتا سر عقلی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دلائل کو پوری طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

چنانچہ اب اس دور کے آغاز سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کر دیا کہ دین کی اصل دعوت، اس کا اصل قانون، اس کا استدلال اور اس کی حجت علمی سطح پر پوری طرح واضح کر دی گئی ہے۔ اس اصل دین، اصل دعوت، اصل قانون اور اصل استدلال میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی حقانیت ثابت نہ کی جا سکے یا جو قابل عمل نہ ہو۔ ایمان و اخلاق کی دعوت، اس کی حجت اور شریعت کا اصل قانون اپنی بے آمیز شکل میں ہر دور اور ہر زمانے میں قابل عمل ہے۔

اس دعوت کو دنیا نے قبول کر لیا تو پھر دنیا میں امن، سلامتی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ آٹومیشن ایج دنیا میں خدا کی رحمت بن کر آئے گی۔ ورنہ دوسری صورت میں ظلم و فساد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ طاقتور کمزوروں کو کچلتے رہیں گے۔

چنانچہ ہمارے نزدیک اس دور کو لانے کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دین کی یہ بے آمیز دعوت پوری دنیا تک پہنچا دی جائے اور دنیا میں امن و خوشحالی آ جائے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی لوگ نہیں مانتے تو پھر اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کے متعلق ایک حتمی فیصلہ کر لیں گے۔ قیامت کا وعدہ پورا کر دیا جائے گا اور انسانیت اپنے کیے کی پاداش میں اپنی تمام تر ترقی سمیت فنا کر دی جائے گی۔

محمد تہامی بشر علوی

”الم“، پر اجر والی روایت کا درست مفہوم

پروردگار نے چاہا کہ زمیں پہ پھرتے میرے بندے جیتے جی خود میں وہ خوبیاں پیدا کر لیں جو کہ ان کے خدا کے ہاں مطلوب ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے بندوں سے جو جو کچھ چاہا قرآن کی صورت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرما دیا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر واضح کیا کہ موت کے بعد جی اٹھنے کے بعد تم کامیاب ٹھہرائے جاؤ گے اگر قرآن میں درج خدائی مطالبات پورے کر مرے۔ قرآن مجید میں خالق خود بتاتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ہدایت کے منصوبے کی تکمیل کے لیے نازل کی گئی ہے اور لوگوں پر لازم ہے کہ اس میں دی گئی ہدایات پر تدبر کی توانائیاں صرف کریں۔ ہدایت اور اس کے ماخذ قرآن مجید کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم امت کو قرآن حکیم سے وابستگی اختیار کرنے کی بھرپور ترغیب دیتے۔ خدائی دین کی معنویت کا تقاضا تھا کہ دین سے وابستگی اپنی ہر شکل میں معنویت کی حامل ہو۔ جہدِ رسالت پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اور دینی مراسم سے وابستگی کو محض رسمی کبھی نہ ہونے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کاوش یہی رہی کہ آپ مومنین کے شعور کا ہر تعلق دین سے وابستہ کر دیں اور دین کے مآخذ قرآن مجید میں ان کا تدبر پوری طرح صرف رہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں یہ منقول نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قرآن حکیم سے رسمی تعلق قائم رکھنے کا فرمایا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو کسی لمحے اس کے مقصد نزول سے الگ نہ ہونے دیا۔ آپ کے تلامذہ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی مقصدیت سے نہ صرف یہ کہ خود وابستہ رہے بلکہ باقی امت کو بھی اسی کی تلقین کرتے رہے۔ قرآن حکیم سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے رسالت مآب سے

منقول روایات کو اس سارے پس منظر میں رکھ کر سمجھنا درست نتیجے تک پہنچنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ورنہ خدشہ ہے کہ سرسری منش طبیعتیں، بامعنی روایات سے بے معنی استدلال کر کے رسمیت پسند مزاجوں کو دین کے نام پر دین کی روح سے مکمل دور کر لینے میں مکمل کامیاب ہو کر رہیں گی۔ گرد و پیش میں پھیلے خدا کے مومن بندوں کا حال آج اگر یہ ہے کہ وہ قرآن اور نماز جیسے بنیادی امور میں بے روح رسمیت کی معراج پر ہیں تو انہیں یہاں تک لانے میں ان فقیہان ملت کے حیلہ جو فہم کا حصہ ہی ہے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بامعنی کلام سے بے معنی نتائج اخذ کرنے میں ہمیشہ جری رہتے ہیں۔ بات واضح ہے کہ خود خدائے حکیم نے اپنی نازل کردہ لازوال کتابِ تدبر کو کتابِ رسم بننے کی ہر راہ واشگاف الفاظ میں روک رکھی ہے۔ اللہ کے رسول نے امت کا ذہن کبھی اس طور پر تشکیل نہ دیا کہ وہ قرآنی مطالبات سے بے خبر رہتے ہوئے، بن سمجھے قرآن کے الفاظ کی ادائیگی کے بل پر ہی قرآن سے تعلق کا دم بھرنے کی جسارت کر سکے۔ مگر فقیہان ملت کو داد دیجئے کہ وہ یہ کام بھی باآسانی کر گزرے۔ انہیں اس مدعا تک پہنچنے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان سے گنجائش نکالنی پڑی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی طرف ترغیب دلانے کے لیے لوگوں سے فرمایا کہ ''جو شخص قرآن مجید کا ایک لفظ پڑھتا ہے اسے ایک نیکی ملتی ہے اور ایک نیکی دس کے برابر ہے'' فیض یافتگانِ نبوت جان گئے تھے کہ مدعا یہی ہے کہ کتاب ہدایت سے ہدایت اخذ کرنا اتنا اہم کام ہے کہ اس کو اس مقصد کی خاطر پڑھتے رہنا بہرحال ضروری ہے۔ اور خدا کا فضل اس پڑھنے میں یوں شامل ہوتا ہے کہ اک اک حرف کے بدلے دس دس نیکیاں نامہ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں۔ کسی کلام کو اپنے مدعا پر باقی رکھ کر سمجھنے کا درست طریقہ یہی ہوتا ہے کہ کلام کے اصل موضوع اور زیر بحث مسئلہ کی نوعیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس روایت میں کہی جانے والی بات کا مقصد لوگوں کو

کتاب ہدایت کے پڑھنے کی اہمیت بتانا تھا۔ یہ پڑھنا وہی پڑھنا ہے جسے عام بول چال میں پڑھنا کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے ہی جیسے کوئی کہے کہ میں نے اخبار کا کالم پڑھا۔ اس پڑھنے میں کہنے سننے والا جانتا ہے کہ اخبار کا کالم پڑھنے کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر کاغذ پر لکھے نقوش کے تلفظ کی خاطر زبان ولب ہلا دیے گئے۔ اسی روایت کا اگلا حصہ اجر کی ہمہ گیری کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''مت سمجھو الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام دوسرا اور میم تیسرا حرف ہے۔'' اس بحث سے قطع نظر کہ یہاں مقطعات والا ''الم'' ہے یا سورہ فیل والا ''الم'' ہے، یہ بات واضح ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سننے والوں نے یہی سمجھا اور درست سمجھا کہ اس ارشاد میں زیر بحث مسئلہ ''بن سمجھے پڑھنا یا سمجھ کر پڑھنا'' ہے ہی نہیں۔ بن سمجھے پڑھنے کا مسئلہ اصلاً عجم میں پیدا ہونے والا مسئلہ ہے جس کا عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کو سامنا ہی نہ تھا۔ یہاں پیش نظر بس یہی ہے کہ لوگوں پر کتاب ہدایت کے پڑھنے کی اہمیت واضح کر دی جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر کی جانے والی ہر کاوش اجر کی مستحق ٹھہرے گی۔ یہی مقصد سامنے رکھ کر اس کتاب کے حروف ونقوش سیکھنا اور ان کا تلفظ ومعانی سمجھنا اجر ہی اجر ہے۔ نزول قرآن کے حقیقی مقصد کے پہلو کو گرفت میں لیے بغیر ان روایات کا مدعا پالینا ممکن نہیں۔ مقصد پیش نظر نہ رہا تو لوگ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کہے سے ان کہا دریافت کر کے اسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا قرار دے کر امت کو مقصدِ قرآن سے ہی دور کر گزریں گے۔ پھر جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں وہی ہوگا کہ رسمیت مقصدیت پر غالب آتے آتے مقصد کو ہی لوگوں کے لیے اجنبی بنا دے گی۔ وہ روایت کے مقصد کو بھی فراموش کریں گے اور الفاظ سے وہ دلالتیں کریدیں گے جو کلام کو اصل مدعا سے برعکس سمت پھیرنے میں ان کی معاون بنیں گی۔ مثلاً ان میں سے بعض یہ کہیں گے کہ حضور نے مثال

میں مقطعات والا ''الم'' ذکر کیا جو دلیل اس بات کی ہے کہ حضور نے بن سمجھے قرآن پڑھنے پہ اجر کی ضمانت دے دی ہے، ورنہ مثال میں ''الم'' نہ ذکر کرتے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا سیاق واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال بن سمجھے پڑھنے کے سیاق میں بیان نہیں فرمائی اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بن سمجھے پڑھنے والی بات کی کسی کو تلقین کی۔ حضور کے مخاطبین عرب تھے وہاں یہ سوال ابھی ابھرا ہی نہ تھا۔ سو واضح ہے کہ یہاں ''الم'' کی مثال بن سمجھے پڑھنے کی مثال کے طور پر ذکر نہیں کی گئی بلکہ اجر کی نوعیت بتانے کے لیے بیان فرمائی گئی کہ ایک حرف سے مراد پورا لفظ نہیں بلکہ ایک ہی حرف ہے۔

شدید خدشہ ہے کہ اس منش کے فقیہان ملت کہیں یہ استدلال بھی نہ کر گزریں کہ اس حدیث کی رو سے ''خنزیر اور ابلیس کا پانچ پانچ حرفی نام لینے پر پچاس پچاس نیکیاں ملتی ہیں چونکہ ان کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے۔''

خدانخواستہ ایسا استدلال ہوا تو اس کی غلطی یہ نہیں ہوگی کہ تلاوت میں ابلیس وشیطان وخنزیر کے نام پڑھنے پر اجر نہیں ملنا بلکہ غلطی یہ ہوگی کہ فہم قرآن کے مقصد کو نظر انداز کر کے حدیث سے وہ مدعا اخذ کر دیا گیا جو سرے سے حدیث کا موضوع ہی نہ تھا۔ ابلیس کا لفظ ادا کرنے پر پچاس کا اجر اس کے ابلیس ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ قرآن حکیم کے حصے کی حیثیت سے ہے، جس کے فہم کی کاوش کے تحت ابلیس کا نام یا نہ سمجھ آنے والے لفظ کا تلفظ بھی باعث اجر ہے۔ اگر خنزیر و ابلیس کو فہم قرآن کے مقصد سے ہٹا کر تلفظ کیا جاتا رہے تو ایک نیکی بھی کسی کے حصے میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ خاص یہ استدلال کہ حدیث میں خنزیر کہنے پر پچاس نیکیاں ملنے کا کہا گیا ہے، تبھی درست ہوتا جب حدیث کا موضوع متعین طور پر یہ ہوتا کہ خنزیر وابلیس کا نام لینا اجر کا باعث ہے یا نہیں اور ہے تو کتنے اجر کا باعث ہے؟

اب سمجھیے کہ اس روایت کے اصل سیاق و موضوع اور قرآن مجید کی تلاوت و نزول کے مقاصد کو سامنے رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پوری بات یہ بنتی ہے کہ "قرآن مجید ماخذ ہدایت ہے، اس سے ہدایت اخذ کرنے کا مطالبہ ہر مومن سے ہے۔ اس مقصد کی خاطر اسے سیکھنا سمجھنا پڑھنا ہر ہر قدم پر اجر ہی اجر ہے۔ اور اجر کی نوعیت یہ ہے کہ اک اک حرف پر دس دس نیکیاں ملیں گی، اس سے ہدایت اخذ کرنے کے مقصد کے لیے کوئی عربی حروف تہجی سیکھنے کے مرحلے میں ہو گا، کوئی ناظرے کی مشق کر رہا ہو گا، کسی کی زبان رک رک کر چل رہی ہو گی مگر یہ سب کاوشیں فہم قرآن کے مقصد سے جڑ جانے کے باعث لائق تحسین و لائق اجر ٹھہریں گی۔ اس مقصد سے مربوط ہونے کے باعث ابلیس و خنزیر کے ناموں کا تلفظ بھی پچاس پچاس نیکیوں کا باعث ہو گا اور ہر وہ لفظ بھی کہ جس کا معنی معلوم نہ ہو یا معلوم کیا جانا ابھی باقی ہو۔ اک لمحے کے لیے بھی حصول فہم کا مقصد سامنے سے ہٹا دیا جائے تو یہ تمام کاوشیں خدا کے ہاں بے معنی قرار پائیں گی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ خود مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے امت پر واضح کر دیا کہ بغیر توجہ کے پڑھی جانے والی نماز اور تقوی کے حصول کے مقصد کے بغیر رکھا گیا روزہ کل قیامت کے دن لپیٹ کر واپس منہ پر مار دیا جائے گا۔

مومنو! جو جو جان چکے ہو خدا کے نام پر خدا کی کتاب کے ساتھ یہ مذاق بند کر دو کہ عمر بھر پڑھنے کو ہونٹ و زبان کی حرکت تک محدود کر گزرو اور اس پڑھنے کو فہم و ہدایت کے مقصد سے ہی نہ جڑنے دو۔ خدا گواہ ہے اس نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے پڑھنے پر کسی جگہ کسی ایسے اجر کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا جس پڑھنے کا مقصد اسے سمجھنا اور ہدایت اخذ کرنا نہ ہو۔

وما علینا الا البلاغ

رؤف کلاسرا

ایک کہانی ایک سبق!

ویک اینڈ فلموں اور کتابوں کے لیے مخصوص ہے۔ پچھلے ہفتے ایک ڈاکومنٹری دیکھ لی اور اب تک اس کے رومانس سے نہیں نکل سکا۔ ڈیڑھ گھنٹے پر محیط یہ ڈاکومنٹری 1986ء میں امریکی سیاست میں سینیٹر بن کر داخل ہونے والے جان میکین پر بنائی گئی ہے اور اس میں اُن کی پوری زندگی کو سمو دیا گیا ہے۔ جان میکین اس وقت برین کینسر سے لڑ رہے ہیں اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ اس ڈاکومنٹری میں بل کلنٹن سے لے کر جارج بش، بارک اوبامہ، ہیلری کلنٹن، نائب امریکی صدر جو بائیڈن و دیگر سینیٹروں اور اہم لیڈروں کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے کی اس ڈاکومنٹری نے میرے اندر یہ یقین پیدا کیا ہے کہ انسان کو زندگی ہائی مورال گراؤنڈ پر گزارنی چاہیے۔ ہائی مورال گراؤنڈ پر بسر کی گئی زندگی کے آگے بڑے سے بڑا عہدہ، شکست اور فتح بے معنی چیزیں ہیں۔ دنیا میں ہائی مورال گراؤنڈ سے بڑا اعزاز کوئی نہیں ہے۔

ویتنام جنگ میں پانچ سال تک جنگی قیدی رہنے والے جان میکین کی زندگی ایک ایسا سبق ہے جو مجھے حیران کر گیا کہ ایک انسان کے اندر اتنی اخلاقی جرات بھی ہو سکتی ہے؟ میں اس ڈاکومنٹری کی تفصیلات بتا کر آپ کے مزے کو خراب نہیں کرنا چاہتا تاہم دو تین چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اگرچہ جان میکین عراق جنگ کے حق میں تھا لیکن جب عراقی قیدیوں پر امریکی فوجیوں کے تشدد کی تصویریں سامنے آئیں اور جس طرح کمیٹی کی اوپن سماعت میں جان میکین نے اپنی ہی پارٹی کے سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کا حشر کیا وہ اپنی جگہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک سین جس نے مجھ پر بہت اثر کیا وہ ہے جب میکین دو ہزار آٹھ میں بارک اوبامہ کے خلاف ری پبلکن کی طرف سے امریکہ کا صدارتی امیدوار بنتا ہے اور مختلف جلسوں سے خطاب کر

رہا ہوتا ہے۔ انہی دنوں اوبامہ کے خلاف یہ مہم شروع ہوگئی تھی کہ اس کا باپ عرب مسلمان ہے۔ ری پبلکن کے حامی چاہتے تھے کہ عرب فیکٹر کو اوبامہ کے خلاف استعمال کر کے اسے ہرایا جائے۔ اس لائن کو لے کر ایک جگہ جب جان میکین لوگوں کے سوالات کا جواب دے رہا ہوتا ہے تو ایک 75 سالہ بوڑھی عورت کہتی ہے کہ وہ اوبامہ پر بھروسہ نہیں کرتی کیونکہ وہ ایک عرب ہے۔ وہ عورت ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ جان میکین نے آگے بڑھ کر اس سے مائیک چھین لیا۔ اور زور سے بولا: ہرگز نہیں...... اوبامہ ایک شریف النفس خاندانی انسان ہے۔ وہ اچھا امریکی ہے۔ میں اس کے خلاف الیکشن لڑ رہا ہوں کیونکہ اس کا میرے ساتھ کچھ نظریات پر اختلاف ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ جان میکین وہ الیکشن ہار گیا لیکن اس نے بارک اوبامہ کی ذات کے خلاف ایک بھی لفظ سننے سے انکار کر دیا۔

برسوں بعد جب اس ڈاکومنٹری کے لیے بارک اوبامہ جان میکین کے اس غیر معمولی اشارے کے بارے میں بات کر رہا تھا تو صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے سیاسی مخالف کی اس بات سے کتنا متاثر ہوا تھا۔ اسی طرح جب ری پبلکن پارٹی کے اندر جان میکین سے جارج بش کا مقابلہ چل رہا تھا کہ کسے امریکی صدارت کے لیے نامزد کیا جائے گا تو جارج بش کے حامیوں کی طرف سے جان میکین کے خلاف ووٹرز کو فون کالز جانا شروع ہوگئیں کہ اس نے ایک خفیہ شادی کی ہوئی ہے۔ جان میکین کو کہا گیا کہ وہ بھی نیگیٹو الیکشن مہم چلائے۔ جان میکین نے ایک دفعہ پھر ایسی مہم اپنے مخالفین کے خلاف شروع کرنے سے انکار کر دیا۔ جان میکین کے خلاف ایک سکینڈل آیا کہ اس نے ایک پراپرٹی ٹائیکون کو کچھ فوائد دینے کی کوشش کی تھی جو اس ریاست کے ہر سینیٹر کو فنڈ فراہم کرتا تھا۔ یعنی وہ دن جان میکین کی زندگی کے بہت مشکل دن تھے تاہم جس طرح جان میکین نے خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے لڑائی لڑی اور جیتی اسے سکرین پر دیکھنا اپنی جگہ ایک کمال تجربہ ہے۔

جان میکین کی ہائی مورال گراؤنڈ پر کی گئی سیاست کو دیکھتے ہوئے مجھے پاکستان کی قومی اسمبلی

یاد آ گئی جس کا ایک سکینڈل کچھ دن پہلے میں نے اپنے پروگرام میں بریک کیا تھا جس پر عمران مگھرانہ نے ریسرچ کی تھی۔اس سکینڈل کے مطابق پچھلے پانچ سالوں میں ایم این ایز نے جعلی حاضریاں لگا کر لاکھوں روپے کا سیشن الاؤنس جیبوں میں ڈال لیا تھا۔اس سکینڈل کا انکشاف اس وقت ہوا جب اکیس مئی کو قومی اسمبلی میں اس وقت کورم پورا نہ تھا اور دو گھنٹے انتظار کے بعد سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق نے اجلاس ملتوی کر دیا۔کورم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہاؤس میں کم از کم 86 ایم این ایز موجود ہوں۔اس دن ہاؤس میں مطلوبہ افراد نہ تھے تاہم جب ایم این ایز کے لیے اسمبلی میں رکھا گیا حاضری رجسٹر چیک کیا گیا اس کے مطابق ہاؤس میں 115 افراد تھے۔اگر ایک سو پندرہ ایم این ایز موجود تھے تو پھر کورم کیسے پورا نہ تھا؟ پتہ چلا کہ جو ایم این ایز ہاؤس میں موجود نہ تھے ان کی حاضری رجسٹر پر لگ چکی تھی۔یہ کام اس لیے کیا گیا تھا کہ جو ایم این ایز ہاؤس نہ آسکے تھے وہ پانچ ہزار روپے الاؤنس لے سکیں۔میں ابھی تک صدمے میں ہوں کیسے ایک ایم این اے جھوٹی حاضری اس لیے لگواتا ہے کہ پانچ ہزار روپے مل جائیں۔خود ایم این ایز ایک دوسرے کی جعلی حاضریاں لگاتے ہیں۔ایک ایم این اے کی اوقات صرف پانچ ہزار روپے ہے؟

یہ سب سوچتے ہوئے میں اس وقت حیران رہ گیا جب جان میکین کی ڈاکومنٹری وہاں تک پہنچ چکی تھی جب وہ برین ٹیومر کا آپریشن کرانے کے کچھ دن بعد فلائٹ لے کر سینیٹ میں ہیلتھ بل پر ووٹ ڈالنے پہنچ گیا۔ڈاکٹرز نے اسے بہت منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ری پبلکن کا خیال تھا کہ وہ ان کا سینیٹر ہے لہذا انہیں ہی ووٹ دے گا لیکن جان میکین نے بل پر ووٹ ڈالنے سے پہلے جو تقریر کی وہ سننے سے تعلق رکھتی ہے۔اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو اس نے اپنی ہی پارٹی پر بم شیل گرا دیا کہ وہ ان کے بل کو ووٹ نہیں ڈالے گا۔اور ہنس کر بولا: ابھی میرے جن دوستوں نے میری تعریفیں کی ہیں وہ یقیناً اب پچھتانے کا حق رکھتے ہیں۔جان میکین نے اپنے ضمیر پر اپنی پارٹی کے خلاف ووٹ ڈالا اور ہاؤس سے نکل گیا۔

ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں جان میکین میں بھی ہوں گی۔ اس کی زندگی میں بھی شرمندگی کے لمحات موجود ہیں۔ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر اس نے دوسری شادی کر لی۔ اس کی طلاق یافتہ بیوی سے جب پوچھا گیا تو وہ بھی بولی: جان میکین کی موت اسے دکھی کر دے گی۔ تاہم وہ منظر میرے ذہن میں رک سا گیا جب جان میکین واشنگٹن چھوڑ کر ایریزونا اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا جہاں وہ زندگی کے باقی دن گزار رہا ہے۔ ایک مطمئن انسان اور سیاستدان جس نے اپنے تئیں ہائی مورال گراؤنڈ پر زندگی بسر کی جسے ڈاکٹرز بتانے سے کچھ ہچکچا رہے تھے کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن اس نے اصرار کر کے پوچھا کہ کتنے دن باقی ہیں؟ سنا اور مسکرا پڑا۔

دور دور تک پہاڑوں کے درمیان واقع ایک خوبصورت فارم ہاؤس میں اپنی زندگی کے دن گزارتے ہوئے جب آپ ایک ایسے سیاستدان سے ملاقات کرتے ہیں جس کی زندگی بہت کم رہ گئی ہو تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ بعض لوگ موت کو قریب دیکھ کر بھی نہیں ڈرتے۔ اُن کے اندر ایک ایسا یقین پیدا ہو جاتا ہے جو آپ کو حیران کر دیتا ہے۔ اس ڈاکومنٹری کے اس سین کا اثر میرے ذہن اور روح پر رہے گا کہ موت سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ایک انسان کیسے مطمئن انداز میں اپنی بیوی اور کتے کے ساتھ فارم ہاؤس پر آخری دن گزار رہا ہے۔ ایک ایسا انسان جس نے شکست قبول کر لی تھی لیکن بھرپور اصرار کے باوجود اس نے بارک اوبامہ کے خلاف وہ گھٹیا حربے استعمال کرنے سے انکار کر دیا جو اسے شاید امریکہ کا صدر بنوا سکتے تھے۔ امریکہ کا صدر بننے کے لیے اس نے خود کو نہیں گرایا۔ اپنے کردار اور آئیڈیاز پر کمپرومائز نہیں کیا۔ رات گئے جب وہ ڈاکومنٹری ختم ہوئی تو مجھے اچانک احساس ہوا کہ جس انسان اور سیاستدان نے ہائی مورال گراؤنڈ پر زندگی بسر کی اور سیاست کی ہو، اس کے لیے جہاں اس کے سیاسی مخالفین باتیں کرتے کرتے آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں وہیں موت بھی ایسے انسان کا احترام کرنے پر مجبور ہوتی ہے!

خواتین کی صحت مندانہ سرگرمیاں

ایک تحقیق کے مطابق سست یا غیر فعال رہنے والی خواتین میں زیادہ تیزی سے بڑھاپا آنے کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔اس تحقیق میں پندرہ سو خواتین نے حصہ لیا تھا۔ یہ وہ خواتین تھیں جو زیادہ تر وقت یا تو بیٹھ کر گزارتی تھیں یا پھر ہر روز چالیس منٹ سے کم وقت تک ورزش کیا کرتی تھیں۔تحقیق کے بعد ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسی خواتین کے خلیے فعال تو ہیں لیکن زیادہ ورزش کرنے والی خواتین کے مقابلے میں نامیاتی طور پر وہ اپنی عمر سے آٹھ سال بڑی دکھائی دیتی ہیں۔محققین کا کہنا ہے کہ اگر صحت اچھی نہ ہو اور ہمارا طرز زندگی ٹھیک نہ ہو تو بڑھاپا تیزی سے آتا ہے، اس لیے بڑھاپے میں بھی انسان کو سست نہیں رہنا چاہیے اور دن میں دس گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

خواتین گھر کے کام کاج سے اپنی کیلوریز تو گھٹا سکتی ہیں، لیکن اسے ورزش کا متبادل ہرگز نہ سمجھا جائے، کیوں کہ ورزش کی اپنی جگہ اہمیت ہے اور اس کے اپنے فوائد ہیں۔ ورزش کے دوران انسان کی سانسیں اور دل کی دھڑکن معمول سے بڑھ جاتی ہے۔جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھنے لگتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے جس کی وجہ سے اس کا وزن مناسب رہتا ہے۔اس طرح روزانہ ورزش کرنے والی خواتین موٹی جسامت سے نہ صرف بچی رہتی ہیں، بلکہ ایک اور فائدہ انہیں یہ ہوتا ہے کہ وہ دائمی اور موذی امراض سے بھی دور رہ سکتی ہیں۔

گھر کے کام کاج خود کرنے سے بھی جسمانی ورزش ہو جاتی ہے۔فرش پر اچھے طریقے سے موپ (پونچھا) لگانے سے نہ صرف وہ چمک اٹھتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے جسمانی تندرستی بھی برقرار رہتی ہے۔ویکیوم کلینر سے قالین صاف کرنے سے کیلوریز کی بڑی مقدار جل جاتی ہے۔لان کی صفائی مالی سے کروانے کے بجائے اگر خاتون خانہ خود کریں، پودوں کے گملے بھی خود ہی صاف کریں، انھیں پانی دیں اور سوکھے پتے اٹھا کر ایک طرف رکھیں اور گھاس کاٹنے والی مشین استعمال کرنے سے بھی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔

ماضی کے مقابلے میں آج خواتین کو ورزش کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، کیوں کہ اس مشینی دور میں انھیں ویسی محنت نہیں کرنا پڑتی جو پہلے دور میں خواتین کیا کرتی تھیں۔ جس طرح وہ ہاتھ سے کپڑے دھوتی تھیں اور پانی بھرنے کے لیے خود پیدل جاتی تھیں، ان کاموں سے بھی خواتین کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی، لیکن آج کے اس جدید دور میں یہ سارے کام مشینیں بخوبی سرانجام دے رہی ہیں اور خواتین کا جسمانی کام یا محنت بہت کم ہو گئی ہے۔ لیکن آج کی خواتین جسمانی طور پر تو نہیں مگر ذہنی طور پر بہت تھکنے لگی ہیں۔ دماغی تھکاوٹ کی وجہ سے خواتین کے لیے اپنی تمام سرگرمیوں کو عمدگی سے انجام دینا کافی مشکل ہوتا جا رہا ہے، اس لیے ورزش کرنا اچھی صحت کے لیے ناگزیر عمل ہے۔ ورزش سے ایک تو جسم توانا رہتا ہے اور دوسرے کاموں کی تکمیل میں بھی کوئی دقت یا پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔

آج کل خواتین کو موٹاپے، دل کی بیماریوں اور ذیابیطس سے بچنا بہت ضروری ہے، اسی مقصد کے لیے جسمانی توانائی کی اشد ضرورت ہے۔ سیلز اور ٹشوز کی تعمیر و مرمت کے لیے ورزش کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف آپ کا وزن کم ہوگا بلکہ آپ کی سلم اور سمارٹ ہونے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ ورزش کو جب معمول بنا لیا جائے تو کھانے، پینے کی عادات بھی بدل جاتی ہیں۔ غذائیت سے بھرپور خوراک آپ کی جسمانی توانائی کے لیے بہت مفید ہے۔ ورزش کرنے سے جسم مضبوط اور ذہن تر و تازہ محسوس ہوتا ہے۔ قدرتی ماحول کی تازگی اور ٹھنڈک جسم پر حاوی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جسم سے ایسے ہارمون خارج ہونے لگتے ہیں جو ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ورزش سے دل کی صحت بھی برقرار رہتی ہے۔ جسم میں آکسیجن جذب کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ماہرین صحت کا خیال ہے کہ بیماریوں کے بڑھتے ہوئے حجم کی دو بڑی وجوہ ہیں: ان میں سے ایک غذائی بداحتیاطی اور دوسری سہولت پسند طرز زندگی ہے جس میں جسمانی سرگرمیاں نمایاں طور پر کم ہیں۔ خواتین میں ایک غلط خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سارا دن گھریلو کاموں کے دوران ورزش ہوتی رہتی ہے، چنانچہ ان کے خیال

میں ورزش کے لیے الگ سے وقت نکالنا غیر ضروری ہے۔

آغا خان یونیورسٹی کی فیزیوتھراپسٹ سے جب اس پر رائے مانگی گئی تو انھوں نے کہا: ''جب ہم مسلسل کم ازکم بیس منٹ اپنے جسم کو حرکت دیں اور یہ عمل مخصوص وقت پر باقاعدگی سے کیا جائے تو اسے ورزش کا نام دیا جاتا ہے۔ گھریلو کام بھی فائدے مند ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس کے بعد ورزش کی ضرورت نہیں رہتی تو یہ غلط ہے۔ سارا دن ہم جو خوراک کھاتے ہیں، وہ کیلوریز کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے پھر متحرک رہنے کی وجہ سے کیلوریز استعمال ہو جاتی ہے لیکن اس سے پٹھوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ گھریلو کاموں کو مخصوص انداز سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، بعض اوقات یہ کام نقصان کی وجہ بھی بن جاتے ہیں، مثال کے طور پر خاتون خانہ لگاتار پانچ گھنٹے کپڑے دھوتی رہے تو یہ بھی غلط ہے، کیوں کہ ایک ہی پوزیشن میں زیادہ دیر رہنے کی وجہ سے کمر میں درد ہونے لگتا ہے، تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ طبیعت میں چڑچڑا پن بھی آ جاتا ہے۔''

خواتین ورزش کے لیے انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کرتی ہیں جو ان کی زندگی کے لیے ایک بڑا خطرہ ثابت ہو رہی ہے۔ ایک اہم مطالعے کے نتیجے سے پتا چلتا ہے کہ ایسی نوجوان خواتین جن کی عمریں تیس سال کے آس پاس تھیں اور وہ غیر فعال زندگی گزار رہی تھیں، ان میں ہارٹ اٹیک کا خطرہ فعال خواتین کی نسبت پچاس فی صد سے زیادہ تھا۔ آپ چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا گھنٹہ ورزش کے لیے ضرور نکالیں، تاکہ جسمانی تندرستی حاصل ہو اور ذہنی خلفشار سے بھی چھٹکارا مل سکے۔ پہلے ہفتے میں دو سے تین دن ورزش کے لیے مقرر کر لیں پھر آہستہ آہستہ پانچ سے چھے دن تک آ جائیں اور اس طرح روزانہ ورزش کرنا اپنا معمول بنا لیجیے، تاکہ بیماریوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ خوشگوار زندگی سے بھی لطف اٹھا سکیں۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

پروین سلطانہ حنا

غزل

دریچے اپنی وفا کے کشادہ رکھتے ہیں
تمہاری عرضِ طلب سے زیادہ رکھتے ہیں

محبّتوں کا ہم ایسا ارادہ رکھتے ہیں
جو دِل کی راہ سے گزرے وہ جادہ رکھتے ہیں

انھیں حوادثِ دوراں کا غم نہیں ہوتا
کتابِ عشق سے جو استفادہ رکھتے ہیں

خمارِ درد میسّر ہے اہلِ عرفاں کو
غریقِ عشقِ خدا ذوقِ بادہ رکھتے ہیں

نہ خوفِ خارِ مغیلاں، نہ راستے کی تھکن
ارادۂ سفرِ پا پیادہ رکھتے ہیں

کسی کے غم پہ پریشاں یونہی نہیں ہوتے
ہم اہلِ درد محبّت زیادہ رکھتے ہیں

ہمیں عداوتِ پنہاں کا فن نہیں آتا
ہم آپ ہی کی طرح دل بھی سادہ رکھتے ہیں

ہوائے تازہ کی مانند ہیں تیری یادیں
ہم اپنے دل کے دریچے کشادہ رکھتے ہیں

خدائے پاک تو لوح و قلم کا مالک ہے
تیرے حضور یہ دل ہم تو سادہ رکھتے ہیں

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجئے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھئے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجئے...... یا ایک پے آرڈر/بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح المحد ود (صدر برانچ)

اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے

رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے

ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے

ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

AUG 2018
Vol. 06, No. 08
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed **Printers: The Sami Sons Printers,**

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi